آسماں کیسے کیسے

شکیل فاروقی



پیاری بیٹی

اور

پیاری نواسی

کے نام

پیش لفظ

"قلم برداشتہ" کے زیرِ عنوان نابغہ روزگار شخصیات کے بارے میں روزنامہ ایکسپریس میں شایع ہونے والے کالموں پر مشتمل یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔

یہ شخصیات اپنی مثال آپ ہیں۔ بقولِ غالب:

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

شکیل فاروقی

نصیر ترابی

موت ایک ایسی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جس سے نہ تو انکار ممکن ہے اور نہ ہی فرار۔ اس کا ایک دن، تاریخ اور وقت مقرر ہے۔ مرزا غالبؔ کے بقول:

موت کا ایک دن معین ہے

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

فقیر منش شاعر بھگت کبیر نے موت کو مالی، دنیا کو گلشن ہستی اور انسانوں کو پھول و کلیوں سے نہایت خوبصورت تشبیہ دیتے ہوئے یہ دوہا تخلیق کیا ہے۔

مالی آوت دیکھ کے کلیاں کہت پکار

پھول پھول چُن لے گیو کالھ ہماری بار

ترجمہ: مالی (موت) کو آتا ہوا دیکھ کر کلیاں پکار پکار کر یہ کہتی ہیں کہ وہ آ رہا ہے اور پھولوں کو چن چن کر لے جائے گا اور کل ہماری باری آ جائے گی۔

کبیر نے اپنے ایک اور دوہے میں انسان کی زندگی کو پانی کے بلبلے اور صبح کے تارے سے تشبیہ دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

پانی کیرا بُدبُدا اَس مانس کی جات

دیکھت ہی چھپ جات ہے جوں تارا پر بھات

ترجمہ: انسان کی زندگی پانی کے بلبلے کی طرح ناپائیدار ہے اور یہ صبح کے تارے کی طرح مختصر ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے غروب ہو جاتا ہے۔ میر تقی میر نے اسی خیال کو اپنے شعر کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے

یہ نمائش سراب کی سی ہے

فانیؔ بدایونی نے موت کو ماندگی کا وقفہ قرار دیتے ہوئے یہ شعر کہا ہے:

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے

یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

برج موہن چکبستؔ نے موت کے حوالے سے بڑے کمال کا شعر کہا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے انھی اجزاء کا پریشان ہونا

قصہ مختصر یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ چند روزہ زندگانی ہے۔ کُلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت زندگی ایک سفر ہے، جس میں طرح طرح کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ایک دن موت کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتے ہیں۔ بس یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔

جیون کے سفر میں راہی ملتے ہیں بچھڑ جانے کو

اور دے جاتے ہیں یادیں تنہائی میں تڑپانے کو

گزشتہ 8 جنوری کو ہمارے ساتھ یہی سانحہ پیش آیا۔ ہمارے پیارے دوست نصیر ترابی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ یاری اور وضع داری ان پر ختم تھی۔ "پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں" والی کہاوت

ان پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ قدرت نے انھیں بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ ان کی شخصیت پہلو دار تھی۔ وہ بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ ان کے والد بزرگوار علامہ رشید ترابی کی علمیت اور عظمت کا ڈنکا ساری دنیا میں بجتا تھا۔ اس حوالے سے ان کا یہ دعویٰ سو فیصد درست تھا کہ پدرم سلطان بود، لیکن انھوں نے اپنا مقام خود پیدا کیا، بقول اقبال :

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

سرِّ آدم ہے، ضمیر کن فکاں ہے زندگی

نصیر ترابی حیدر آباد (دکن) کے ایک عالی گھرانے میں 15 جون 1945 کو پیدا ہوئے۔ علم و ادب ان کی گھٹی میں شامل تھا اور زبان دانی انھیں ورثے میں ملی تھے، جسے انھوں نے اپنی محنت اور کاوش سے دو آتشہ کر دیا۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل انھوں نے جامعہ کراچی سے صحافت کے مضمون میں M.A پاس کر کے کی اور اپنے کیریئر کا آغاز ایک معروف انشورنس کے ادارے میں پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت سے کیا۔

مگر ان کی شہرت کی خوشبو ان کی شاعری سے پھیلی جس کی بدولت انھیں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا شمار صف اول کے شعرائے کرام میں ہونے لگا۔ غزل ان کی پسندیدہ صنف سخن قرار پائی۔

اس صنف سخن کا انتخاب انھوں نے میر، غالب، انیس اور اقبال جیسے عظیم شاعروں سے متاثر ہو کر کیا۔ انھوں نے روز اول سے لے کر تادمِ آخر غزل کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اپنے ہم عصر بہت سے شعرا کرام کی روش سے اجتناب کرتے ہوئے انھوں نے غزل گوئی میں اپنے جوہر خوب دکھائے جس کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ کلاسیکی انداز کی غزل گوئی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ انھوں نے بسیار گوئی سے ہمیشہ اجتناب کیا، کیونکہ وہ مقدار کے نہیں، معیار کے قائل تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام دیگر ہم سخنوں کے مقابلے میں نمایاں کشش رکھتا ہے۔ اس حوالے سے وہ بلاشبہ نابغہ روزگار قرار پائے ہیں۔ ان کی شاعری کے دونوں مجموعے (عکس فریادی، اور لاریب،) ان کے لازوال شاہکار ہیں۔ شاعری کے علاوہ اُردو زبان سے ان کا شغف بھی بڑا گہرا تھا اور اُردو لغت سے انھیں فطری دلچسپی تھی جس کا جیتا جاگتا ثبوت ان کی کتاب "شعریات" ہے جسے ملک کے معروف ادارہ پیراماؤنٹ پبلشنگ ہاؤس نے نہایت اہتمام کے ساتھ شایع کر کے اُردو زبان و ادب کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے، جس کا کریڈٹ اس ادارے کے روح رواں اقبال محمد صالح کو جاتا ہے۔

اپنے مرحوم دوست نصیر ترابی مرحوم کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے چند برجستہ اشعار پیش خدمت ہیں جن میں آپ کو ان کی ایک انتہائی مقبول غزل کا عکس دکھائی دے گا:

وہ باوفا بھی تھا اور اس میں دل ربائی بھی تھی

یہ بات ہم نے کئی بار آزمائی بھی تھی

عجیب رنگ تھا رندانہ اس کی گھٹی میں

چھپی چھپی سی مگر اس میں پارسائی بھی تھی

عجیب شخص تھا اور اس کی شاعری بھی عجیب

قلندری میں مگر اس کی کج کلاہی بھی تھی

عجیب طرزِ تکلم، عجیب سا ہی مزاج

عجیب لہجے میں اپنی غزل سنائی بھی تھی

مثالِ تیر اترتی گئی دلوں میں شکیلؔ

کسی نے اس کی غزل اس طرح سے گائی بھی تھی

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا

شہنائی بڑا عجیب ساز ہے، جس کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے:

کیا عجب ساز ہے یہ شہنائی

دو سُروں کا یہ کھیل سارا ہے

ایک سُر زندگی کا سنگم ہے

دوسرا موت کا کنارہ ہے

انسانی زندگی بھی شہنائی سے عبارت ہے۔ اس میں غم بھی ہے اور خوشی بھی۔ اس میں آہ بھی ہے اور واہ بھی۔ دسمبر کے مہینے پر بھی یہی بات صادق آتی ہے کہ اس مہینے کے دوران کئی عظیم شخصیات نے اس دنیا میں قدم رنجہ بھی فرمایا اور کوچ بھی کیا۔

جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح، محترمہ بے نظیر بھٹو، مرزا اسد اللہ خان غالب اور نابغہ روزگار شمس الرحمن فاروقی جیسی عہد ساز شخصیات شامل ہیں۔ یہ بھی کیا حسن اتفاق ہے کہ شاعر بے مثل مرزا غالب 27 دسمبر کو پیدا ہوئے اور شمس الرحمن فاروقی نے 25 دسمبر کو اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ فاروقی صاحب نہ صرف مرزا کے مداح تھے بلکہ بلا کے غالب شناس بھی تھے جن پر یہ مصرعہ حرف بہ حرف صادق آتا ہے:

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرف دار نہیں

پرتاب گڑھ کے شمس الرحمن فاروقی کا یوم پیدائش 30 جنوری 1935 ہے۔ وہ اتر پردیش بھارت کے شہر کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی ماحول انتہائی مذہبی تھا، جس کا انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔

ان کے بقول اسی ماحول کی بدولت ان کا رجحان کمیونزم کی طرف کبھی مائل نہیں ہوا۔ ایک زمانے میں وہ جماعت اسلامی سے بھی وابستہ رہے، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور انھوں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی، جس کا ذکر انھوں نے خود بھی کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے دوری کی طرح جماعت سے الگ ہونے کی وجہ بھی ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ وہ کسی مخصوص طرز فکر کے پابند ہونے کے قائل نہیں تھے۔

مذہبی پس منظر رکھنے کے باوجود انھوں نے انگریزی تعلیم میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے انگریزی زبان میں M.A کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد سول سروس کا رخ کیا، اردو کے علاوہ انھیں انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے جوہر انگریزی زبان میں دکھائیں۔

تاہم ان کا رخ اردو کی جانب مڑ گیا۔ سچ پوچھیے تو یہ اردو زبان کی خوش قسمتی تھی۔ اس حوالے سے وہ ہندی بھاشا کے جانے مانے ممتاز شاعر ڈاکٹر ہری رائے بچن کے مماثل تھے، جنھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تو انگریزی کے مشہور شاعر ڈبلیو بی یٹس (W.B. Yeats) پر تھیسس لکھ کر حاصل کی اور انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں۔ لیکن شہرت اور بقائے دوام ہندی کوی کے طور پر حاصل کی۔ انگریزی زبان کے وسیع مطالعے نے انھیں اردو کا اعلیٰ پائے کا نقاد بننے میں بڑا فائدہ پہنچایا۔

فاروقی صاحب ایک ہمہ صفت شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے نقاد بھی اور نثر نگار بھی۔ ان تمام جہتوں میں وہ اپنی مخصوص شناخت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز سات سال کی عمر میں ایک خوبصورت مصرعے سے کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ شاعری میرے رگ وپے میں رچی ہوئی ہے۔ شعر گوئی کا دامن انھوں نے اپنی آخری سانس تک نہیں چھوڑا۔

گنج سوختہ، سبز اندر سبز، آسماں محراب اور مجلس آفاق میں پروانہ ساں کلیات ان کی سخن وری کے شاہکار ہیں، لیکن ان کی شہرت کا ڈنکا تنقید نگاری اور فکشن کے حوالے سے بجا۔ اگرچہ ان کی تخلیقی صلاحیت کا جوہر صرف تین کتابوں تک محدود ہے لیکن ان کی شہرت کو اسی نے دو آتشہ بنایا۔ ان کا شمار اردو کے بہترین فکشن رائٹرز میں ہوتا ہے۔

ان کے یہاں غالب کو وہی مقام حاصل ہے جو انگریزی زبان میں شیکسپیئر کو حاصل تھا۔ 1966 میں انھوں نے شب خون کے نام سے ایک ادبی رسالہ شایع کرنا شروع کیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے اردو ادب میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کیا۔ اگر اس رسالے کا موازنہ شاہد احمد دہلوی کے معروف رسالے "ساقی" سے کیا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

شب خون" نے ادبی دنیا میں دھوم مچادی اور اپنی مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اس ادبی جریدے" میں جگہ پانا کسی بھی تخلیق کار کے لیے ایک سند کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ اس کے ہر شمارے میں مرزا غالب کے بارے میں کوئی نہ کوئی تذکرہ ضرور شامل ہوتا تھا، جو فاروقی صاحب کی غالب شناسی اور غالب سے عقیدت کا ثبوت تھا۔

تنقید کے حوالے سے فاروقی صاحب کا خیال تھا کہ نقاد کے لیے قواعد وضوابط سے واقفیت اور عمل لازمی ہے۔ شتر بے مہار قسم کے نقادوں سے انھیں چڑ تھی۔ وہ انھیں نقاد ہی نہیں مانتے تھے۔ کیونکہ محض تخلیق کاروں کے کیڑے نکالنا تنقید کا مطلب ہرگز نہیں۔ تنقید کا مطلب تنقیص نہیں ہوسکتا۔ شمس الرحمن فاروقی کا کمال یہ ہے کہ جہاں انھوں نے جدید تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے وہیں انھوں نے کلاسیکی قلم کاروں کی عظمت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ فاروقی صاحب جیسے نابغہ روزگار روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

شمس الرحمن فاروقی کا نظریہ تنقید کے حوالے سے دیگر نقادوں سے مختلف تھا۔ ان کے نزدیک اردو زبان کے کلاسیکی شعرا کرام اپنی مثال آپ تھے۔ اس کے برعکس بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انگریزی زبان کے شعرا اور لکھاری انگریزی کے قلم کاروں کے ہمسر نہ تھے۔ مثال کے طور پر سر سید احمد خان نے انگریزی زبان کے شاعر ولیم ورڈزورتھ کو اردو شاعروں کے لیے ایک رول ماڈل قرار دیا تھا۔ اسی طرح ترقی پسند

لوگوں کے نزدیک کلاسیکی شاعری کی جدید شاعری کے مقابلے میں زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جدید شاعری ہی اصل اہمیت کی حامل ہے۔

شمس الرحمن فاروقی کے نزدیک شاعری کو نہ تو کسی روایت کا پابند ہونا چاہیے اور نہ کسی مخصوص نظریے کا۔ ان کے خیال میں اچھی شاعری اور فکشن وہ ہے جو خود رو ہو اور جو فطرت کی ترجمانی کرتی ہو۔

عظمت کے مینار

گزشتہ چند ماہ کے دوران بادِ فنا کے جھونکوں نے طوفان کی صورت اختیار کرلی ہے جس کی زد میں آکر علم و ادب، فکر و فن اور صحافت و سیاست کے روشن چراغ یکے بعد دیگرے گل ہو رہے ہیں:

صحافت و سیاست کے روشن چراغ یکے بعد دیگرے گل ہو رہے ہیں:

جن کے دم سے تھی بزم کی رونق

ہائے وہ لوگ اٹھتے جاتے ہیں

یہ گوہرِ نایاب اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملیں گے۔ اسی قبیل کے لوگوں کے بارے میں اقبال نے یہ کہا تھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس تحریر کا مقصد ان عظیم اور نابغہ روزگار ہستیوں پر تبصرہ کرنا ہرگز نہیں کہ یہ ہمارا نہ منصب ہے اور نہ مقام۔ ان کی عظمت کو بیان کرنا بھی سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ ہمارے اس قلم برداشتہ کا واحد اور اصل مقصد صرف اور صرف ان رفتگان کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اور ان کی یاد کو تازہ رکھنا ہے۔

آغازِ کلام ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب کے سانحہ ارتحال سے کہ جو علم و دانش کے کوہِ گراں، پرچمِ اسلام کے علم بردار اور اردو ڈائجسٹ کے بانی و مدیرِ اعلیٰ تھے۔ اس کے علاوہ وہ "کاروان علم فاؤنڈیشن" جیسے عظیم خدمتی ادارے کے بانی اور روحِ رواں بھی تھے جو غریب و نادار گدڑی کے لعلوں کی تعلیم کے لیے مالی اعانت فراہم کرکے علم کے چراغ روشن کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہمارا ایک بالواسطہ تعلق بھی تھا اور وہ یہ کہ مرحوم ہمارے پیارے دوست اطہر اعجاز کے والد بزرگوار تھے۔

اردو ڈائجسٹ کے حوالے سے انھیں اگر محسن اردو کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک اور Trend Setter تھے۔

آبروئے صحافت، عبدالقادر حسن بھی اسی چل چلاؤ کے سیل رواں کی نذر ہوگئے۔ ان کے سانحہ ارتحال سے "بزم ایکسپریس" سونی اور ویران محسوس ہوتی ہے۔ بقول شاعر:

آ کہ تجھ بن دوست کچھ اس طرح گھبراتا ہوں میں

جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

بلاشبہ وہ اردو صحافت کے نکتہ داں بلکہ میر کارواں تھے۔ ان کی صحافت برسوں کی ریاضت سے عبارت تھی۔ صداقت، جرأت اور صاف گوئی ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی تھے۔ وہ ایک صاحب اسلوب قلم نویس تھے اور ان کی تحریروں پر ان کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ مستقبل کے کالم نویس ان کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

موت کا ریلا عظیم سیاستدان اور وطن عزیز کے شریف النفس سابق وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی کو بھی بہا کر لے گیا۔ انھیں ملک کے سب سے بڑے مگر سب سے پسماندہ صوبے بلوچستان کا واحد وزیراعظم ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہے۔ میر حاصل بزنجو (مرحوم) کی طرح وہ بھی سیاست برائے خدمت کے قائل تھے اور اعتدال اور نرم خوئی ان کی شناخت تھی۔

ہم ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں جنھیں ان سے متعدد ملاقاتیں کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن کے سربراہ کی حیثیت سے ہماری ان سے کافی قرابت رہی جو ہمارے لیے سرمایہ حیات سے کم نہیں۔

خدا بخشے کہ کیا کیا خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

علم و ادب کے شعبے سے وابستہ کسی بھی عظیم ہستی کی رحلت ایک ناقابل تلافی نقصان اور بہت بڑے سانحے سے کم نہیں۔ وطن عزیز کے ایک نہایت لائق اور معروف ماہر تعلیم و دانشور غلام علی

الانہ المعروف جی۔الانہ طویل علالت کے بعد گزشتہ دنوں کراچی کے ایک اسپتال میں انتقال کر گئے۔الانہ صاحب ایک ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ ماہر لسانیات بھی تھے۔ سندھ یونیورسٹی کے کامیاب ترین وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی ان کی مثالی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔بلاشبہ وہ ایک نابغہ روزگار تھے۔

ان سے ہمارا تعارف اس زمانے میں ہوا جب ہم بحیثیت اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان، حیدرآباد تعینات کیے گئے اور ہم نے فاران کلب، حیدرآباد، سندھ یونیورسٹی اور ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے باہمی تعاون سے دیال داس کلب، حیدرآباد میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا جس کی صدارت جناب قتیل شفائی نے کی اور نظامت کے فرائض سندھی زبان کے معتبر قلم کار اور شاعر اور براڈکاسٹر نصیر مرزا نے انجام دیے۔فاران کلب کے روح رواں جناب نذر محمد قریشی اس تقریب کے سرگرم ہم رکاب تھے۔اس سلسلے میں الانہ صاحب کے ساتھ ہماری متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔اور قربت حاصل ہو۔

درویش صفت شاعر میر دردؔ نے انبوہِ مرگ کے حوالے سے جو کچھ کہا تھا وہ ان اصحاب رفتگاں کے حوالے سے اس وقت بے ساختہ یاد آرہا ہے:

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

گوہرِ نایاب ثریا شہاب

لوگ اچھے ہیں بہت دل میں اتر جاتے ہیں

اک برائی ہے تو بس یہ ہے کہ مر جاتے ہیں

قذاقِ اجل نقارہ بجا بجا کر دن رات لوگوں کو لوٹ رہا ہے اور اس کے آگے سب کے سب بے بس اور لاچار ہیں۔ ابھی عظیم اداکار و ہدایت کار اور ڈرامہ پروڈیوسر عابد علی کی وفات کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دنیائے کرکٹ کے نابغہ روزگار اور گوہرِ نایاب رائٹ آرم لیگ اسپنر عبد القادر کے سانحہ ارتحال کی غم ناک خبر کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ لیجنڈری نیوز کاسٹر ثریا شہاب کی مسحور کن آواز کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانے کی دل شکن منحوس خبر سننے کو ملی۔ آواز وہ جادو سا جگاتی ہوئی آواز۔ یہ لافانی آواز ریڈیو اور ٹی وی کے بے شمار سامعین کے کانوں میں سدا رس گھولتی رہے گی۔

اخباری ذرائع کے مطابق وہ عرصہ دراز سے سرطان اور الزائمر کے مرض میں مبتلا تھیں اور اسلام آباد میں مقیم تھیں۔ ان کے لواحقین میں دو صاحب زادے اور ایک صاحب زادی شامل ہیں۔ سامعین کی صورت میں ان کے سوگ وار پرستاروں کا کوئی شمار نہیں جن کے دل اداس اور آنکھیں اشک بار ہیں۔ 12 ستمبر جمعرات کی شام ان کی طبیعت اچانک اتنی خراب ہو گئی کہ انھیں اسپتال لے جانے کا موقع بھی نہ مل سکا اور جمعہ کی مبارک صبح وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں اور یوں ان کے تحریر کردہ شاہکار ناول "سفر جاری ہے" کے عنوان کا ہر حرف عین حقیقت ہے بقول شاعر:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے

یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

ریڈیو پاکستان جو پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کا نگہبان، مملکت خداداد کا ترجمان، پاکستانی قوم اور دنیا بھر میں پاکستان کی پہچان ہے فنکاروں اور نشر کاروں کی اولین اور بہترین تربیت گاہ بھی ہے جن کے ناموں کی

فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ سچ پوچھیے تو اسی ادارے سے تربیت یافتہ ناموروں نے پی ٹی وی کی بھی آبیاری کر کے اسے بام عروج تک پہنچایا۔

چنانچہ ثریا شہاب جیسی غیر معمولی صلاحیت والی صدا کارہ کو آواز کی دنیا بشمول ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن میں متعارف کرانے کا سہرا عظیم براڈ کاسٹر اور ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر جنرل اور پی ٹی وی کے سابق ایم ڈی آغا ناصر جیسے جوہر شناس کے سر ہے۔ ثریا شہاب نے اپنے براڈ کاسٹنگ کیریئر کا آغاز ریڈیو پاکستان سے ممتاز و معروف شاعر، ادبی شخصیت اور منفرد ڈرامہ نویس سلیم احمد (مرحوم) کے تحریر کیے ہوئے ایک خوبصورت ڈرامے سے کیا جس نے ان کی شہرت اور مقبولیت کے ڈنکے بجا دیے۔

ثریا شہاب کی عمر اس وقت 15-14 سال کے لگ بھگ تھی۔ بمشکل ایک سال ہی گزرا تھا کہ ان کی آواز کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا اور انھیں ریڈیو ایران زاہدان سے بلاوا آ گیا جہاں انھوں نے دس سال تک اپنی آواز کا جادو جگایا اور ریڈیو تہران کے ایک میگزین پروگرام کو غیر معمولی مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچایا۔ پھر وہ وطن عزیز پاکستان آ گئیں اور نیوز کاسٹر کی حیثیت سے ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی کے ساتھ وابستہ ہو گئیں اور یہاں بھی اپنی کامیابی اور غیر معمولی مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ان کی آواز اور شخصیت میں بلا کی کشش اور غیر معمولی جاذبیت تھی۔ حسن سیرت کے بغیر خوبصورتی نامکمل اور ناتمام ہے۔ اس حوالے سے کسی شاعر نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کیا خوب فرمایا ہے:

سیرت کے ہم غلام ہیں، صورت ہوئی تو کیا

سرخ و سفید مٹی کی مورت ہوئی تو کیا

رب کریم نے ثریا شہاب کو ظاہری حسن سے بھی زیادہ باطنی حسن سے نوازا تھا۔ وہ انسانی ہمدردی، سادگی اور خوش گفتاری کا پیکر تھیں۔ عاجزی اور انکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حسن اخلاق ان کا طرہ امتیاز تھا۔ دکھی انسانیت کی بے لوث خدمت کرنا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن تھا جس کی تکمیل میں وہ ہمہ تن زندگی بھر مصروف رہیں۔ "یوتھ لیگ" (Youth League) نامی

فلاحی تنظیم کے پلیٹ فارم سے انھوں نے خدمت خلق کے بے شمار کام انجام دیے جو ان کی بخشش اور مغفرت کا سامان بنیں گے۔ ان کی شخصیت اعلیٰ اوصاف اور بلند اقدار کا مجموعہ تھی۔

ان سے مل کر ہمیشہ تازگی اور فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ جو بھی ان سے ملتا تھا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان سے ہماری پہلی ملاقات ریڈیو پاکستان اسلام آباد کے شعبہ خبر کے اردو سیکشن میں ہوئی جہاں اکثر ہماری بیٹھک ممتاز نیوز کاسٹرز کے ساتھ ہوا کرتی تھی جس میں عبدالسلام (مرحوم) کے علاوہ دیگر ممتاز نیوز کاسٹرز خالد حمید اور حمید اختر کے نام قابل ذکر ہیں۔ اردو یونٹ کے پیارے اور محبتی ارکان بشمول وقار علی شاہ سے ہمارے یارانے کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ سب سے بڑھ کر ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر آف نیوز اور جوہر قابل سید نذیر بخاری کے ساتھ نیاز مندی کا اٹوٹ تعلق بھی اسی سنہری دور میں قائم ہوا۔

کے ساتھ آواز کے زیر و بم پر مکمل کنٹرول پر Stress اور Pause شِ، ق، کے درست تلفظ اور بہترین' عبور رکھتے ہوئے شائستہ لب و لہجے میں بروقت خبریں پڑھنا کبھی ریڈیو پاکستان کا طرہ امتیاز ہوا کرتا تھا۔ افسوس کہ اب وہ درخشندہ روایت برقرار نہیں رہی اور عالم یہ ہے کہ بعض نیوز کاسٹرز تو اپنے نام میں شامل ش ق کا درست تلفظ تک نہیں کر سکتے۔ براڈ کاسٹنگ ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ اس کے کچھ مخصوص تقاضے اور لوازمات ہیں۔ لیکن نجی نشریاتی اداروں کی بھرمار اور یلغار نے براڈ کاسٹنگ کے شعبے کی مٹی پلید کر دی ہے۔ جسے دیکھیے اینکر اور نیوز کاسٹر بنا ہوا ہے۔

ہم نے ریڈیو پاکستان کے ممتاز نیوز کاسٹرز کو بہت قریب سے دیکھا ہے، ان میں اپنے ہم نام لیجنڈری نیوز کاسٹر اور 1965 کی پاک بھارت جنگ میں اپنے گھن گرج والے منفرد اور مخصوص انداز میں خبریں پڑھ کر پاکستانی عوام اور افواج پاکستان کے حوصلے بلند کرنے والے شکیل احمد کے علاوہ شمیم اعجاز اور انور بہزاد جیسے عظیم نیوز کاسٹرز بھی شامل ہیں جو خبروں کے پڑھنے سے پہلے ریہرسل کے لیے کم از کم ایک گھنٹے پہلے آکر نیوز بلیٹن کو Scan کر کے اس کا اس حد تک پوسٹ مارٹم کر دیا کرتے تھے کہ اس کا خاصہ بڑا حصہ انھیں حفظ ہو جاتا تھا۔

ثریا شہاب کی کامیابی کا اصل راز اپنے پیش روؤں کی اسی روایت کی پیروی میں مضمر ہے۔ وہ نیوز بلیٹن کے نشر ہونے کے مقررہ وقت سے بہت پہلے آتی تھیں اور نہایت خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ خبریں پڑھنے کی ریہرسل میں منہمک ہو جاتی تھیں۔ وہ آج کل کی نیوز کاسٹرز جیسی بالکل بھی نہیں تھیں جو "کاتا اور لے دوڑی" کی غلط روش پر گامزن ہیں اور بغیر کسی تیاری کے مائیکروفون پر آکر خبریں پڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور غلطی پر غلطی کرتی ہیں اور بار بار لڑکھڑا لڑکھڑا کر نیوز بلیٹن کا بیڑا غرق کر دیتی ہیں۔ ثریا شہاب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ریڈیو پاکستان کی دو نمایاں نیوز کاسٹرز عشرت ثاقب اور ثمینہ وقار اپنا مقام بنا رہی ہیں۔

ثریا شہاب نے ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی کے علاوہ معروف بین الاقوامی نشریاتی اداروں بی بی سی، وائس آف امریکا اور وائس آف جرمنی کے لیے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اگرچہ بنیادی طور پر ثریا ایک براڈ کاسٹر تھیں لیکن شعر و ادب بھی ان کی شخصیت کا ایک قابل ذکر حوالہ ہے۔ ان کی کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن میں شاعری کی ایک کتاب، افسانوں کا ایک مجموعہ اور دو ناول شامل ہیں۔ شاعری میں پنجابی زبان کی شاعری کی مقبول صنف "ماہیا" بھی شامل ہے۔ کم سنی میں ریڈیو ایران زاہدان سے وابستگی کی وجہ سے ثریا شہاب کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی جس کی تکمیل انھوں نے وطن واپسی کے بعد کی۔ جرنلزم اور پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ پولیٹیکل سائنس میں ڈاکٹریٹ کرنا چاہ رہی تھیں کہ انھیں کینسر کا موذی مرض لاحق ہو گیا اور ان کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی۔

ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے قومی نشریاتی رابطے پر پیش کیے جانے والے بے حد مقبول پروگرام "صبح پاکستان" میں گزشتہ 15 ستمبر بروز اتوار ثریا شہاب کی رحلت کے حوالے سے ایک خصوصی تعزیتی رپورٹ نشر کی گئی جو ریڈیو پاکستان کے چند سابق ارکان کے تاثرات پر مبنی محض ایک رسمی کارروائی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ افسوس کہ انھیں ان کی زندگی میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ مستحق تھیں۔ یہی سلوک ریڈیو پاکستان کے بے مثل نیوز کاسٹر شکیل احمد (مرحوم) کے ساتھ روا رکھا گیا جو نشریاتی محاذ پر قوم کے عظیم ہیرو تھے۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ برسوں تک ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی سمیت مختلف نشریاتی اداروں سے دنیا بھر کی خبریں سنانے والی نابغہ روزگار نیوز کاسٹر ثریا شہاب کے انتقال پر ملال کی خبر ان کے پرستاروں کو تاخیر سے ملی۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ان کی پاکیزہ روح یہ صدا بلند کر رہی ہو:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفس وہ خواب ہیں ہم

بزمِ سخن اُداس ہے شاعر تیرے بغیر

اردو شعر و ادب کی نامور اور ممتاز شخصیت حمایت علی شاعر علالت کے بعد 16 جولائی کو کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں انتقال کر گئے:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

انھوں نے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد 93 سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا شمار ان خوش نصیبوں میں ہوتا ہے جنھیں اپنے زندگی کے دوران ہی غیر معمولی عزت و شہرت نصیب ہوئی اور جن کی عظمت کا اعتراف بھی ان کے شایان شان کیا گیا۔ ان کا اصل نام حمایت علی اور "شاعر" ان کا تخلص تھا۔ وہ 14 جولائی 1926 کو برٹش انڈیا کے دور میں اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ابھی ان کی عمر صرف تین سال کی تھی کہ ان کی والدہ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا جس سانحے کا احساس انھیں ہمیشہ ستاتا رہا۔

1949 میں ان کی شادی معراج نسیم کے ساتھ انجام پائی جن کی رفاقت میں انھوں نے اپنی زندگی کے 52 سال گزارے۔ وہ بھی کینیڈا، اونٹاریو میں پکرنگ کے مقام پر مدفون ہیں۔ اگرچہ ابتدا میں ہی حمایت علی شاعر نے بائیں بازو کے رجحانات سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔

حمایت علی شاعر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ منفرد لب و لہجے کے شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک صحافی، اداکار، صداکار، فلمی نغمہ نگار، نثر نگار اور عظیم براڈ کاسٹر بھی تھے۔ انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز بطور صحافی کیا اور حیدر آباد (دکن) سے شایع ہونے والے اردو اخبارات جناح، منزل اور ہمدرد میں خدمات انجام دیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو دکن (حیدرآباد، انڈیا) میں بھی بحیثیت نثر کار خدمات دیں۔ لیکن ریاست حیدرآباد دکن پر بھارتی فوجوں کے ناجائز قبضے کے بعد ریڈیو دکن کا نام تبدیل کر کے آل انڈیا ریڈیو رکھ دیا گیا جس کے بعد 1950 میں ترکِ وطن کر کے حمایت علی شاعر پاکستان آکر ریڈیو پاکستان کراچی

سے وابستہ ہوگئے جہاں سے تبادلے کے بعد انھوں نے ریڈیو پاکستان حیدرآباد (سندھ) میں بھی خدمات انجام دیں۔

1964 میں انھوں نے سندھ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کا امتحان پاس کیا اور پھر ایک عرصے تک وہیں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ریڈیو پاکستان کے ساتھ بحیثیت رائٹر اور براڈکاسٹر ان کی خدمات کا سلسلہ 15 سال پر محیط ہے۔ اسی عرصے کے دوران ہمارا ان کے ساتھ تعلق قائم ہوا جو تادم آخر برقرار رہا۔ ہم انھیں "حمایت بھائی" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ وہ انتہائی ملنسار، خوش گفتار اور سادہ مزاج انسان تھے۔ ایسے عظیم اور مثالی انسان کہ جن پر سُرور بارہ بنکوی کا یہ مشہور شعر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہوجائے وہ لوگ

آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

حمایت بھائی کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے جس شعبے کو بھی چھوا، اس میں اپنی انفرادیت اور عظمت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ بحیثیت شاعر ان کا کلام اور ترنم منفرد اور لاجواب تھا۔ بطور فلمی نغمہ نگار ان کے لازوال گیت لوگوں کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ ان کی پروڈیوس کی ہوئی بے مثال اور لازوال فلم "لوری" کو عوام کبھی فراموش نہیں کرسکتے جس کے مکالمے احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیے تھے۔ یہ بھی کیا عجیب اتفاق ہے کہ قاسمی صاحب کا انتقال پُرملال بھی اسی ماہ رواں یعنی جولائی میں ہی ہوا تھا۔ حمایت علی شاعر کے مشہور فلمی نغموں کے یہ بول عوام کے کانوں میں آج بھی رس گھولتے ہیں:

"نہ چھڑا سکوگے دامن نہ نظر بچا سکوگے، جاگ اٹھا ہے سارا وطن، خداوندا یہ کیسی آگ سی لگتی ہے سینے میں، جب رات ڈھلی، ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ۔"

فلم اور ریڈیو کے علاوہ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے بھی حمایت علی شاعر نے گراں قدر خدمات انجام دیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ 700 سالہ نعتیہ شاعری کے حوالے سے پی۔ٹی۔وی پر

پیش کیا گیا، ان کا تحقیقی پروگرام "عقیدت کا سفر" سرفہرست ہے۔ ان کے دیگر قابل ذکر ٹی وی پروگراموں میں غزل اس نے چھیڑی، خوشبو کا سفر اور "محبتوں کے سفیر" شامل ہیں۔

حمایت علی شاعر کا منفرد کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خودنوشت "آئینہ در آئینہ" مثنوی کی صورت میں تحریر کی۔ ان کے فلمی نغمات کا مجموعہ بھی "تجھ کو معلوم نہیں" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شعری تخلیقات کے تراجم دیگر زبانوں میں بھی شایع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کی امنِ عالم کے موضوع پر مشہور نظم "آگ میں پھول" کا انگریزی میں ترجمہ راجندر سنگھ ورما نے نہایت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ حمایت علی شاعر کا ایک منفرد کارنامہ 33 مصرعوں پر مشتمل ایک نئی صنفِ سخن کی ایجاد ہے جو "ثلاثی" کے نام سے مشہور ہے۔ بطورِ نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے

اس جہاں میں تو اپنا سایا بھی

روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

اب ان کی غزلوں کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر

!میرِ کارواں یارو! میرِ کارواں یارو

درج بالا شعر کرپٹ سیاستدانوں کے حوالے سے آج بھی مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ یہ چند اشعار بھی اپنی مثال آپ ہیں:

چہرے پہ عمر بھر کی رفاقت رقم سہی

دل کے لیے تمام سفر لمحہ بھر کا تھا

....

آتش کدۂ دل کو ہوا کیوں نہیں دیتے

پتھر تو نہیں لوگ صدا کیوں نہیں دیتے

....

اِک جبرِ وقت ہے کہ سہے جا رہے ہیں ہم

اور اُس کو زندگی بھی کہے جا رہے ہیں ہم

2007 میں ان کا شعری مجموعہ "کلیاتِ شاعر" کے عنوان سے چھپ کر منظر عام پر آیا، جسے قارئین نے بے حد سراہا۔ 1989 میں انھیں دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں مخدوم محی الدین انٹر نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا جب کہ ان کی بے بہا خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انھیں 2002 میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ 1962 میں انھیں فلم "آنچل" اور 1963 میں فلم "دامن" پر نگار ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ 2002 میں ہیوسٹن (امریکا) کے ریڈیو اسٹیشن ینگ ترنگ نے مشہور پاکستانی گلوکاروں کے گائے ہوئے ان کے نغمات اور خود حمایت علی شاعر کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے، ان کے کلام پر مشتمل سی۔ڈی کا اجرا کیا۔

بزمِ سخن اُداس ہے شاعر ترے بغیر

میاں محمدؒ بخش کی یاد میں (۱)

زبان انسانوں کے مابین ابلاغ کا وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم اپنی بات ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ گویا زبان رابطے کی وہ کڑی ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ جوڑتی ہے۔ لہٰذا دنیا بھر کی تمام زبانیں پل کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن افسوس کہ ہم نے اپنی آنکھوں پر تعصب کی عینک لگا کر ان پلوں (bridges) کو رکاوٹوں (barriers) میں تبدیل کر دیا ہے۔

لسانی تنازعات ہماری اسی کج نظری اور کوتاہی کا نتیجہ ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہماری دنیا مختلف زبانوں کی صورت میں مہکتے ہوئے خوش نما گلہائے رنگارنگ سے سجا ہوا ایک حسین گلدستہ ہے جس کے ہر پھول کی خوشبو سے یہ جہان جنت نشان مہک رہا ہے۔

ترجمہ ایک زبان کے مفہوم کو دوسری زبان کے سانچے میں ڈھال کر ایک انسان سے دوسرے انسان کو منتقل کرنے کے فن یا ہنر کا نام ہے۔ اچھا ترجمہ وہ ہے کہ جو با محاورہ ہو اور مکھی پر مکھی مارنے کے مترادف نہ ہو۔ چنانچہ اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اسے دونوں زبانوں پر پورا اور یکساں عبور حاصل ہو۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں سارا مزہ کرکرا ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے نظم کا ترجمہ کرنا زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ امر نہایت خوش آیند ہے کہ آج کل غیر ملکی اور علاقائی زبانوں کے ترجمے منظرِ عام پر آ رہے ہیں اور خوب پسند کیے جا رہے ہیں۔

شرح کلام میاں محمد بخشؒ، سیف الملوک و بدیع الجمال "قابلِ ذکر ہے جسے ابوالکاشف قادری نے" پنجابی زبان سے اردو کے سانچے میں نہایت خوش اسلوبی اور کمال مہارت سے ڈھالا ہے۔ تحقیق و تدوین کا فریضہ محمد عثمان ماہی نے انجام دیا ہے اور اس خوبصورت کتاب کے ناشر ہیں "مشتاق بک کارنر" الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

میاں محمد بخشؒ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ آپ پنجابی زبان کی شہرہ آفاق مثنوی "سفر العشق" المعروف بہ "سیف الملوک" کے خالق ہیں جس کا موازنہ ملک محمد جائسی نامی ہندی زبان کے نابغہ روزگار درویش سخنور کی اثر انگیز ہندی مثنوی "پدماوت" سے کیا جا سکتا ہے۔ دونوں درویشوں کے قلوب عشق حقیقی سے سرشار اور معمور تھے اور دونوں ہی اصحاب کا مقصد حیات دین

اسلام کو عوام تک پہنچانا اور غیر مسلموں کو عشقیہ داستانوں کی کشش کے ذریعے دائرہ اسلام میں لانا تھا۔ میاں محمد بخشؒ نے "سیف الملوک و بدیع الجمال" جب کہ ملک محمد جائسی نے "پدماوتی" کی عشقیہ داستان کو موضوع کلام بنایا ہے۔

میاں محمد بخشؒ کے والد ماجد حضرت میاں شمس الدینؒ بھی بلند پایہ بزرگ تھے۔ ان کے اپنے ہی شعر کے مطابق ان کی پیدائش چک ٹھاکرا نامی گاؤں میں پوٹھوہار کی ناہموار گھاٹیوں میں ہوئی جب کہ سن پیدائش 1830 ہے۔

میاں محمد بخشؒ نے تمام عمر تجرد کی زندگی گزاری اور اپنے آباواجداد کے ورثے سے دست بردار ہو کر دنیا داری سے بے نیازی اور کنارہ کشی اختیار کر لی۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں والی کہاوت آپ پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ چنانچہ جب آپ کی والدہ صاحبہ آپ کو خلیفہ صاحبزادہ عبدالحکیم کی خدمت میں حاضری کے لیے لے کر گئیں تو اس درویش نے آپ کو ایک نظر دیکھ کر ہی آپ کی روحانیت کو تاڑ لیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس ہونہار بچے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے کیونکہ یہ بچہ بڑا ہو کر ایک جہان کو روشن کرے گا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف چھ سال کی تھی۔ صاحب نظر کی یہ پیش گوئی صد فیصد درست ثابت ہوئی۔ آپ کو سہوالی شریف میں حافظ محمد علی صاحب کی درس گاہ میں تعلیم و تربیت کے لیے داخل کرا دیا گیا جہاں سے آپ نے درجہ کمال حاصل کیا۔

ظاہری علوم سے فراغت کے بعد آپؒ کو باطنی علوم کی پیاس ستانے لگی تو آپ اپنے گھر کو خیرباد کہہ کر ولی کامل کی تلاش میں نکل پڑے۔ دوران سفر آپ نے روزے رکھے، چلے کاٹے اور ہمہ وقت عبادت و ریاضت میں مصروف رہے اور بے شمار ولیوں اور صوفیوں کی کفش برداری اور خدمت گزاری کی۔

بالآخر پیر سائیں غلام محمد کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف بیعت حاصل کیا۔ بیعت کے فوراً بعد اپنے مرشد کے حکم پر آپ نے اپنے کندھے پر کمبل ڈالا اور پیدل سفر کشمیر پر روانہ ہو کر سری نگر کی راہ لی۔ ان دنوں سری نگر کا راستہ بڑا کٹھن اور دشوار تھا۔ مگر آپ راستے کی تمام

صعوبتوں کا مردانگی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں بالآخر سری نگر پہنچ گئے جہاں آپ کو شیخ احمد ولیؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جس کے بعد شیخ کامل نے آپؒ کو دستار ولایت عطا کی۔

آپ کے والد کا وصال 1263 میں ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر 15 سال تھی۔ چار سال تک آپ اپنے والد صاحب کے کمرے میں ہی مقیم رہے اور 19 سال کی عمر میں آپ اس رہائش کو خیر باد کہہ کر احاطہ دربار میں مقیم ہو گئے جہاں آپ نے گھاس پھونس کا ایک چھپر اڈال کر رہائش اختیار کرلی۔ ایک مرتبہ جنگل میں گھومنے پھرنے کے دوران آپ کی ملاقات ایک نورانی بزرگ سے ہوئی جنھوں نے ایک جڑی بوٹی توڑ کر آپ کی جانب بڑھاتے ہوئے فرمایا: "تم چاہو تو تمہارے ہاتھوں اس جڑی بوٹی سے سونا بنوا دوں۔"

جواب میں میاں محمد بخش نے نہایت بے نیازی سے فرمایا "حضرت مجھے تو آپ وہ ترکیب بتائیں جس سے میرا قلب سونے سے بھی زیادہ چمک اٹھے۔" اس جواب کو سن کر وہ بزرگ خوب ہنسے اور پھر رخصت ہو گئے۔ یہ گویا آپ کا ایک امتحان تھا جس میں آپؒ کامیاب قرار پائے۔

جنگلوں اور ویرانوں میں مراقبے، چلہ کشی اور عبادت گزاری حضرت میاں محمد بخشؒ کا روزانہ کا مشغلہ اور معمول تھا۔ اس دوران کئی کئی روز فاقہ کشی کے عالم میں گزر جاتے تھے اور آپ کو بھوک پیاس کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ بس بڑی عجب قسم کی شان بے نیازی تھی۔ آپ اپنے دست مبارک سے جانوروں کو دانہ کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے اور جانور بھی آپ سے بہت مانوس تھے۔ آپؒ کو اپنے بڑے بھائی بہلول بخش کی طرح شعر و شاعری سے بڑا گہرا شغف تھا۔

آپ مولانا عبد الرحمن جامی کی زلیخا بہت جھوم جھوم کر اور لہک لہک کر پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی شہرت کو سن کر سموال میں گوشہ نشین باکمال مجذوب حافظ ناصر صاحب نے آپ کو بلوا کر زلیخا سنانے کی فرمائش کی۔ جب آپ نے اپنے بڑے بھائی بہلول بخش کے ساتھ مل کر ترنم کے ساتھ زلیخا سنائی تو فرط جذبات سے حافظ ناصر صاحب پر اس قدر رقت طاری ہو گئی کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے اور ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر جب وہ وجد کی اس کیفیت سے باہر آ گئے تو انھوں نے

دونوں بھائیوں کو صدق دل سے یہ دعا دی کہ "جاؤ میاں صاحب زادو! تم دونوں پر ہی تمام علوم منکشف کر دیے گئے ہیں۔" (جاری ہے)

اکبر الہ آبادی

انسانی جذبات کی ترجمان ہونے کے باعث شاعری تمام فنون لطیفہ میں ہمیشہ سر فہرست اور سب سے مقبول و معتبر قرار پائی ہے۔ درحقیقت شعر انسان کی داخلی کیفیات واحساسات کی ترسیل کا سب سے بڑا اور اظہار کا سب سے طاقتور اور جادو اثر ذریعہ ہے۔
چنانچہ ایک اچھا شعر شاعر کی زبان یا نوک نظم سے نکلتے ہی سامع اور قاری کے قلب و ذہن میں تیر بہ ہدف کی طرح تیزی سے جا کر پیوست ہو جاتا ہے۔

اچھا شعر اپنے ماحولیاتی اثاثوں کا امین بھی ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کے مایہ ناز شاعر جون کیٹس (John Keats) نے حسین شہ پارے کو لازوال مسرت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ A thing of beauty is a joy forever۔ اس کا یہ قول اعلیٰ شاعری پر بھی اسی طرح حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔ جون کیٹس کو اگر انگریزی شاعری کا میر کہا جائے تو شاید کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس حوالے سے میر صاحب کا یہ مشہور دعویٰ یاد آرہا ہے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔

گزشتہ نومبر کا مہینہ کئی حوالوں سے خصوصی اہمیت کا حامل تھا جس میں حالات حاضرہ کو غلبہ حاصل رہنے کی وجہ سے صرف 9 نومبر کی تاریخ کی اہمیت بوجہ یوم ولادت علامہ اقبال کا تذکرہ تو شامل ہو گیا لیکن علامہ ہی کے دوش بہ دوش ہم عصر لسان العصر اکبر الہ آبادی کو ان کے یوم ولادت مورخہ 16 نومبر کو خراج عقیدت و تحسین پیش کرنا ممکن نہ ہو سکا، گویا:

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

اکبر کا پورا نام سید اکبر حسین رضوی تھا اور وہ 16 نومبر 1846 کو موضع بارہ ضلع الہ آباد (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ہندوتوا کے پرچارک بھارت کے موجودہ حکمرانوں نے الہ آباد کا نام تبدیل کر کے پریاگ رکھ دیا ہے۔ چنانچہ اگر آج اکبر زندہ ہوتے تو انھیں اپنے نام کے آخر میں الہ آبادی کی بجائے پریاگی کا لاحقہ لگانا پڑتا۔ اور یوں وہ اکبر پریاگی کہلاتے۔ اکبر نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد سید تفضل حسین رضوی سے حاصل کی جو نائب تحصیل دار تھے۔

انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز عرض نویس کی حیثیت سے کیا اور پھر نائب تحصیل دار ہوئے اور ترقی کرتے کرتے 1894 میں سیشن جج کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو گئے۔ لیکن 1903 میں صحت کی خرابی کے باعث انھوں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور شاعری کی آبیاری کرتے ہوئے عملی زندگی اختیار کرلی۔ مرزا اسد اللہ خاں کو اگرچہ اپنے آبا کے پیشروسپہ گری پر ہی ناز تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں جو غیر معمولی اور لافانی شہرت حاصل ہوئی وہ شاعری ہی کی بدولت حاصل ہوئی۔ یہی بات علامہ اقبال پر بھی صادق آتی ہے اور جوں کی توں اکبر الہ آبادی پر بھی۔ اگر اکبر محض جج ہوتے تو اپنی زندگی ہی میں فراموش کر دیے جاتے۔ یہ شاعری ہی کا کرشمہ ہے کہ انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا کر لافانی بنا دیا۔

اگرچہ غزل گوئی ان کا مزاج نہیں تھا مگر اقبال کی طرح روایت کی پیروی میں اکبر کو بھی اپنی شاعری کی شروعات غزل گوئی سے ہی کرنا پڑی جس کا انھوں نے حق ادا کر دیا۔ لیکن ان کا اصل میدان طنز و مزاح تھا جہاں ان کی شاعری کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ انھوں نے اپنے تیکھے طنزیہ اور مزاحیہ اشعار سے وہ زبردست کام لیا جو بڑے بڑے مصلح اور واعظ اپنی تقریروں اور مواعظ سے نہ لے سکے۔ اقبال کی طرح مشرقی تہذیب پر مغربی تہذیب کا غلبہ انھیں ذرا بھی گوارا نہ تھا۔ :ان کا کہنا تھا کہ

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے

واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

اکبر ایسی تعلیم کے سخت مخالف تھے جو ہماری نوجوان نسل کو مشرقی تہذیب سے اس حد تک بیگانہ کر دے کہ وہ "کوا چلا تھا ہنس کی چال مگر اپنی ہی چال بھول گیا" والی ضرب المثل کے مصداق اپنے بزرگوں کا ادب و احترام چھوڑ کر انھیں تضحیک و تنقید کا ہدف بنانے لگے۔ اس حوالے سے وہ دو ٹوک کہتے ہیں :

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں

کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر نے زندگی کے کسی بھی غلط پہلو کو اپنی تیکھی تنقید سے نہیں بخشا۔ مذہب، تعلیم، اخلاقیات، تہذیب وتمدن اور سیاست ومعاشرت سمیت سبھی پر انھوں نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور تنقید کے تیز نشتر چبھوئے ہیں۔ وہ ایک جانب شیخ وواعظ پر طنز کرتے ہیں تو دوسری جانب ہماری نئی نسل کی غلط روش پر زبردست چوٹ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ نہ مسٹر کو بخشتے ہیں اور نہ ہی مولانا کو۔ وہ مذہب کے نام پر ریاکاری کے سخت مخالف ہیں۔ وہ محض شکم پروری کے لیے تعلیم کے حصول اور استعمال کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس حوالے سے ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں اور ان کی جرأت اظہار اور انداز بیان کی داد دیں۔

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا

شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ

کھا ڈبل روٹی، کلر کی کر، خوشی سے پھول جا

اکبر حسنِ مستور کی نمائش اور بے حجابی کے سخت مخالف تھے۔ انھیں ایسی تعلیم و طرز معاشرت سے سخت چڑ تھی جو عورت کی ذہنیت کو بے نقاب کر کے اسے سبھا کی پری بنا دے۔ وہ تعلیم نسواں کے نہیں ایسی تعلیم کے خلاف تھے جہاں عورت کی پردہ پوشی برقرار اور محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ کہتے ہیں :

جاتی ہے اسکول میں لڑکی تو کچھ حاصل کرے

کیا ہوا حاصل جو بس بے باک بن کر رہ گئی

اکبر کو جوہر نسواں کی عریانی کسی صورت اور کسی طور بھی گوارا نہیں۔ خواہ کوئی انھیں قدامت اور رجعت پسند ہونے کا طعنہ کیوں نہ دے۔ انھوں نے عورت کی بے پردگی کے خلاف کھلم کھلا جہاد کیا۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار پیش ہیں :

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں

اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا

کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اکبر کی شاعری میں اخلاقیات کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے مزاحیہ کلام میں مسلمانوں کی اخلاقی پستی پر، انھیں ان کے زوال کے اسباب کا احساس دلا کر حالی واقبال کی طرح خواب غفلت سے بیدار کرنے کی دردمندانہ کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

عاجلانہ کر کے سجدے چل دیے گودام کو

جن سے مسجد گونجتی تھی وہ مسلماں اب کہاں

☆☆

نئے مولوی برسرجوش ہیں

جو پیر طریقت ہیں خاموش ہیں

☆☆

اختلافوں کے مہیا ہیں جب امکاں اتنے

متفق ہو نہیں سکتے ہیں مسلماں اتنے

دین ومذہب کے حوالے سے اکبر بحث ومباحث میں الجھنے کو سعی لاحاصل سمجھتے تھے۔ وہ اپنے مشاہدے سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ :

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں

ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

ان کی طویل نظم بعنوان "شریعت وطریقت" ان کی تفہیمی طبیعت وصلاحیت کا شاہکار اور آئینہ دار ہے جس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بہ آسانی وبہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی جیسے عالم و فاضل اہل قلم اور دانشور نے اس نظم کو الہامی قرار دیا ہے۔

سنو دو ہی لفظوں میں مجھ سے یہ راز

شریعت وضو ہے طریقت نماز

طریقت شریعت کی تکمیل ہے

شریعت عبادت کی تکمیل ہے

علامہ اقبال کے فلسفہ "خودی" کے حوالے سے اکبر الہ آبادی کا یہ شاعرانہ تبصرہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں :

ادبار بے خودی سے جو سازش میں مست ہے

اقبال اب خودی کی سفارش میں مست ہے

کار جہاں خدا کے ارادوں کا ہے مطیع

ہر ایک لیکن اپنی ہی خواہش میں مست ہے

اقبال اپنے بس کا نہیں کیا کرے کوئی

اکبر فقط دعائے گزارش میں مست ہے

اکبر الہ آبادی اردو زبان کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انگریزی الفاظ کو اردو کے سانچے میں ڈھال کر ایک نئ طرز کی بنیاد رکھی جس سے آج تک استفادہ کیا جا رہا ہے۔ وہ بامقصد اور خالص مزاحیہ شاعری کے میر کارواں ہیں۔ اگرچہ اکبر اپنی شاعری میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی سے مخاطب ہوئے لیکن ان کا روئے سخن زیادہ تر مسلمانوں ہی کی طرف رہا۔ جس کا اندازہ ان کی خدا پرستی اور حبیب خدا حضرت محمدؐ کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

خوف حق الفت احمدؐ کو نہ چھوڑا ے اکبر

منحصر ہے انھیں دو لفظوں پہ سارا اسلام

شاعری اکبر کی شناخت اور اوڑھنا بچھونا تھی۔ وہ اگر کچھ اور نہ ہوتے تو بھی شاعر ضرور ہوتے۔ ان کے بقول:

بے کار شب کو یوں سر بستر پڑا نہ رہ

اکبر جو تجھ کو نیند نہ آئے تو شعر کہہ

یومِ اقبال اور پیامِ اقبال

علامہ اقبال سے ہمیں پہلی مرتبہ غائبانہ تعارف کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب ہم لغوی معنوں میں بھی طفل مکتب تھے۔ یہ غالباً سن 1940 کی دہائی کا آخری دور تھا جب ہمارے زمانہ طالب علمی کا آغاز ہو رہا تھا۔

یہ دستور تھا کہ درس گاہ میں صبح کے وقت پڑھائی کی شروعات روزانہ باقاعدگی کے ساتھ علامہ اقبال کی مقبول عام دعا سے ہوا کرتی جسے عبادت کا سا درجہ حاصل تھا۔ سب طالب جب یہ دعا بیک آواز انتہائی انہاک اور دل سوزی کے ساتھ جھوم جھوم اور لہک لہک کر پڑھتے تھے تو ان پر وجد کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جسے الفاظ کے ذریعے بیان کرنا ممکن نہیں۔

اس دعا کی سحر انگیزی کا عالم یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ تب سے لے کر آج تک ازبر ہے اور لوح قلب و ذہن میں جوں کا توں محفوظ ہے۔ علامہ کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی اس کی جادوئی اثر پذیری ہے۔ سات عشرے گزر جانے کے بعد بھی یہ دعا اسی سحر انگیز تاثر کے ساتھ ہمارے ذہن کے پردے سے اتر کر آج بھی ہمارے لبوں پر آب رواں کی طرح بدستور جاری و ساری ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

خدا شاہد ہے کہ اس دل سوز اور جاں گداز دعائے درویش کے نورانی اثرات نے اس خاکسار و گنہگار کی زندگی کے تاریک ترین گوشوں میں شعور و آگہی کی جوت جگا دی ہے۔ یہ اقبال اور ان کی پر تاثیر شاعری کا کمال ہے۔ اقبال واقعی اسم بامسمی کہلانے کے حق دار ہیں۔ اقبال، اقبال ہیں۔ منفرد اور یگانہ۔ ان کا رنگ اور آہنگ اچھوتا اور نرالا ہے۔ ان کا کلام بے مثل اور بے بدل ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے

گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

درحقیقت ان کی انتہائی عاجزی و انکساری کا بہترین اظہار اور آئینہ دار ہے۔ علاوہ ازیں اس شعر کے پہلے مصرعے میں نہایت خوبصورتی سے استعمال کیے گئے الفاظ "اپریشک" بمعنی مبلغ اور من بمعنی دل و موہ لینا بمعنی کھینچ لینا ان کی ہندی دانی کی جانب بھی واضح اشارہ کرتے ہیں۔

اقبال پسندی اور اقبال سے عقیدت ہمیں اپنے والد مرحوم سے ورثے میں ملی جو اقبال کے ان خوش نصیب پرستاروں میں شامل ہیں جنھیں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے تاریخی جلسے میں نہ صرف علامہ کی زیارت کا موقع میسر آیا بلکہ کلام شاعر بزبان شاعر سننے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ کلام اقبال کا خاصہ بڑا حصہ قبلہ والد صاحب کو حفظ تھا جسے وہ عالم بے خودی میں بسا اوقات اپنی مترنم آواز میں سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جوں جوں ہم بڑے ہوتے گئے توں توں علامہ اقبال اور اقبالیات سے ہماری دلچسپی بھی بڑھتی چلی گئی۔ تاہم ہمیں آج بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کہ اس معاملے میں پیرانہ سالی کے باوجود ہماری حیثیت آج بھی طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال شناسی کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ اس کار دشوار کی جانب خود علامہ نے یوں اشارہ فرمایا ہے:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

مصور پاکستان علامہ اقبال کی شخصیت، کلام و پیام اور افکار کا تذکرہ بھی بڑا مشکل کام ہے چہ جائیکہ ان کا احاطہ کرنا جو کہ ناممکن کی جستجو کے مترادف ہے۔ ان کے بارے میں اتنا زیادہ لکھے جانے کے باوجود ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی غیر معمولی شخصیت ہے جو ہمہ گیر اور کثیر الجہات ہے۔ وہ ایک عظیم انسان ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ مفکر و فلسفی اور بے مثل قادر الکلام اور منفرد لب و لہجے و اسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا دعویٰ اردو کے علاوہ فارسی زبان تک وسیع ہے جس کا لوہا تمام اہل زبان مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں تحریر کیے گئے ان کے مقالات بھی ان کی سوچ اور اپروچ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ پورا ایران اور فارسی داں طبقہ ان کی فارسی شاعری کی عظمت و ندرت اور انداز بیاں کا قدر شناس اور معترف ہے۔

علامہ اقبال بلند نگاہی، انسانیت پروری اور ایمان کی مکمل پیروی کے ترجمان ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے شدید ناقد اور اسلام اور اس کی عظمت رفتہ کی بحالی کے علمبردار ہیں۔ اس حوالے سے وہ شاعر مشرق کے لقب سے زیادہ شاعر اسلام کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ اس زاویے سے ان کی شناخت سب سے الگ اور سب سے انوکھی ہے۔ حق پرستی ان کا جزو ایمان اور طرہ امتیاز ہے۔ ان کے بقول:

میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ان کے کلام میں ایک قلندرانہ سرمستی و سرشاری ہے جو بزرگان دین سے ان کے قلبی تعلق اور لگاؤ کا ثمر ہے۔ یہ بھی کیا عجیب حسن اتفاق ہے کہ اس مرتبہ ان کا یوم پیدائش سرکار دوعالمؐ کی ولادت مبارکہ سے متصل ہے جن کی ذات اقدس سے بے پایاں عقیدت اور اتھاہ محبت کے حوالے سے علامہ کا یہ شعر بہترین ترجمانی کا آئینہ دار اور شاہکار ہے:

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ اقبال کو ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھرنے کا بڑا دکھ تھا جس کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار اپنے اس درد بھرے شعر میں کیا ہے:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

وطن عزیز اس وقت جس سیاسی گروہ بندی کا شکار اور سنگین صورتحال سے دوچار ہے اس کے حوالے سے علامہ کا درج بالا شعر صدائے بیداری (Wake Up Call) کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی طرح اتحاد بین المسلمین کے حوالے سے علامہ کا درج ذیل شعر بھی فوری توجہ کا حامل اور بلا تاخیر عملی اقدام کا طلب گار ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

نابغہ روزگار قتیل شفائی (۱)

ابھی گزشتہ 7 جنوری بروز منگل شایع ہونے والے ہمارے کالم بعنوان "یادرفتگاں" کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ گزشتہ 5 جنوری کو اس موقر روزنامہ میں شاید ہونے والے حمید احمد سیٹھی کے کالم "قتیل شفائی کی یاد میں" نے ہمارے ممدوحِ مکرم اور شاعرِ بے بدل محترم قتیل شفائی کی یاد تازہ کر دی۔ بزبان شاعر:

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

قتیل صاحب سے ہمارا اولین غائبانہ تعارف جب ہوا تو اس وقت ہم واقعی طفل مکتب تھے۔ غالباً اس وقت ہم ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں بچوں کا سب سے پسندیدہ رسالہ ماہنامہ "کھلونا" ہمارے گھر میں ہر ماہ نہایت پابندی اور باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ "کھلونا" کا سالنامہ بڑے خاصے کی چیز ہوتا تھا جس میں پاک وہند کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی بچوں سے متعلق تخلیقات بڑی دھوم سے شایع ہوتی تھیں جن میں کرشن چندر اور میرزا ادیب جیسے نامور ادیب اور ساحر لدھیانوی، راجہ مہدی علی خاں، حامد اللہ افسر، تلوک چند محروم جیسے ممتاز شعرا کرام کی نظمیں شایع ہوا کرتی تھیں۔

"کھلونا" ہی کے سالنامے میں "گراموفون" کے عنوان سے شایع ہونے والی بچوں کے لیے خاص طور پر لکھی گئی ایک انتہائی دلچسپ نظم کے ذریعے سے ہمیں قتیل شفائی سے پہلی مرتبہ غائبانہ تعارف کا شرف حاصل ہوا۔ نظم کا موضوع ایک پرانا کھٹارا گراموفون تھا جو بجتا کم تھا اور شور زیادہ کرتا تھا۔ سن 1952-53 میں پڑھی ہوئی اس دلکش نظم کی دو تین لائنیں کچھ یوں تھیں:

ٹوٹے پہیوں کی گڑگڑاہٹ ہے
زخمی کوّوں کی پھڑپھڑاہٹ ہے
دیکھنا تو یہ کس کی آہٹ ہے
بج رہا ہے گراموفون اپنا

اس وقت ہمارے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ قتیل صاحب سے کبھی بالمشافہ ملاقات کا ہی نہیں بلکہ ان کی میزبانی اور ان کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کا شرف بھی حاصل ہو گا۔ یہ بھی عجب حسن اتفاق ہے کہ جس "کھلونا" دہلی میں قتیل کی خوبصورت نظم شایع ہوئی تھی اسی

رسالے میں ہماری تحریر کی ہوئی سب سے پہلی نظم بعنوان "کھلنڈرے لڑکے کا گیت" بھی شایع ہوئی اور جس مشہور رسالے "شمع دہلی" میں قتیل صاحب کی غزلیات شایع ہوا کرتی تھیں اسی رسالے میں احقر کی پہلی غزل بھی شایع ہوئی۔

وقت نے یک بہ یک ایک نئی کروٹ لی اور پھر وہ شبھ گھڑی آئی جب بزم شنکر وشا کے زیر اہتمام دہلی میں ہر سال پابندی سے منعقد ہونے والے عظیم الشان انڈو پاک مشاعرے میں قتیل صاحب کو دیکھنے اور سننے کا موقعہ میسر آیا۔ اس مشاعرے کے مہمان خصوصی ہندوستان کے وزیر بحالیات شری مہاویر تیاگی تھے جو انتہائی ادب دوست اور شاعر پرور قسم کے بے حد باذوق انسان تھے۔ پاکستان سے دیگر شعرائے کرام کے علاوہ قتیل شفائی صاحب خصوصی اہمیت کے حامل تھے جنھوں نے اپنے کلام سے مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔ ان کی غزل کا مطلع تھا:

زندگی کے غم لاکھوں اور چشم نم تنہا

حسرتوں کی میت پر رو رہے ہم تنہا

پھر جب اپنے مخصوص انداز میں غزل سناتے سناتے وہ درج ذیل معنی خیز شعر پر پہنچے تو ان پر ہر طرف سے داد پر داد کے ڈونگرے برسنے لگے اور مکرر ارشاد کی صدائیں بلند ہونے لگیں:

اس طرف ترستی ہیں مسجدیں اذانوں کو

اُس طرف شِو... میں رہ گئے صنم تنہا

قتیل صاحب نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔ یہ تھی قتیل شفائی صاحب سے ہماری دور کی ملاقات۔ اس وقت بھی یہ ہمارے کسی گوشہ گمان میں نہ تھا کہ ہماری قسمت کبھی اس قدر مہربان ہوگی کہ ہم قتیل صاحب کے روبرو محو گفتگو ہوں گے۔

ہوا یوں کہ ایک روز ہمیں اپنے آفس میں قتیل صاحب کی اسلام آباد آمد کی خوش خبری ملی۔ ان دنوں ہم ریڈیو پاکستان کے بیرونی نشریات کے شعبے المعروف بہ ایکسٹرنل سروسز کی "ہندی سروس" میں پروگرام منیجر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے جس کا ہدف ہندوستان کے ہندی بولنے والے سامعین تھے جو ہماری یہ نشریات بڑے ذوق و شوق سے سنا کرتے۔ ان نشریات کا مقصد ہندوستانی سامعین کو پاکستان سے روشناس کرانا اور پاکستان مخالف پروپیگنڈے کا ہندی زبان میں منہ توڑ جواب دے کر انھیں اصل حقائق سے باخبر رکھنا اور آگاہ کرنا تھا۔ چنانچہ ہم نے فوراً قتیل صاحب سے رابطہ کیا اور انھیں ہندی سروس کے پروگرام "ان سے ملیے" کے لیے انٹرویو کی دعوت دی جسے انھوں نے نہایت خوشی کے ساتھ قبول کرلیا۔ بر سبیل تذکرہ عرض ہے کہ اس ہفتہ

وار پروگرام کے ذریعے ہم زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والی کسی بھی اہم اور نمایندہ پاکستانی شخصیت کو متعارف کرایا کرتے تھے۔

قتیل صاحب چونکہ شاعری اور خصوصاً فلمی شاعری کے حوالے ہندوستان میں خوب جانے پہچانے بلکہ مانے جاتے تھے اس لیے اس انٹرویو کی خصوصی اہمیت تھی۔ قتیل شفائی صاحب نے وقت مقررہ پر تشریف لاکر نہایت ذوق وشوق سے ریکارڈ کروایا جو سامعین نے بڑے چاؤ سے سنا اور بہت پسند کیا۔ انٹرویو سے قبل اور اسے ریکارڈ کرنے کے بعد قتیل صاحب سے ہماری خوب گپ شپ بھی ہوئی اور ان کی زندگی کے بہت سے پہلو بھی سامنے آئے۔ سب سے دلچسپ بات یہ کہ وہ خاندان مغلیہ کی سب سے بڑی سلطنت کے تاج دار اورنگزیب کے ہمنام تھے۔ قتیل ان کا تخلص اور شفائی لاحقہ تھا جسے انھوں نے اپنے استاد گرامی حکیم محمد یحییٰ شِفاخان پوری سے نسبت اور عقیدت کی بنا پر اپنے نام کا جزو لاینفک بنایا۔ اس کے بعد انھوں نے شاعری کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کی شاگردی بھی اختیار کی جو اتفاق سے ان کے دوست بھی تھے اور پڑوسی بھی۔

قتیل شفائی برٹش انڈیا کے دور میں 1919 میں ہری پور میں پیدا ہوئے اور ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اپنا، اپنے خاندان اور وطن عزیز پاکستان کا نام پوری دنیا میں روشن کرکے 11 جولائی 2001 میں لاہور کے تاریخی شہر میں آخری سانس لے کر سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

احمد ندیم قاسمی کا یہ کہنا حرف بہ حرف بجا ہے کہ "لاہور لاہور ہے"۔ برصغیر پاک و ہند میں دلی کے بعد بے مثل تاریخی، روحانی، ادبی اور ثقافتی اہمیت کا حامل اگر کوئی اور شہر ہے تو وہ لاہور ہی ہے۔ قومی زبان اردو کی پنجاب اور خصوصاً لاہور شہر نے جو خدمت کی ہے اور کررہا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ قتیل شفائی کی سب سے پہلی غزل بھی قمر اجنالوی کے زیر ادارت شایع ہونے والے لاہور ہی کے ہفت روزہ میں چھپ کر منظر عام پر آئی اور مقبول خواص و عوام ہو کر ان کی شہرت کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔

قتیل شفائی نے فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز بھی لاہور ہی کے ایک فلم پروڈیوسر دیوان سرداری لال کی ایک فلم سے کیا تھا جس کا سن 1947 جو تقسیم برصغیر کا سال ہے۔ پاکستان کی پہلی فلم "تیری یاد" (1948) کے نغمے تحریر کرنے کا اعزاز بھی قتیل شفائی ہی کو حاصل ہوا۔ پھر ان کی شہرت سرحد پار بولی ووڈ تک جا پہنچی جہاں ان کے فلم ساز مہیش بھٹ جیسے پرستاروں نے ان کی شاعرانہ صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بھارت میں قتیل صاحب کا ڈنکا بجایا اور

ان کے نام کو خوب خوب چمکایا۔ فلمی گیت کار کی حیثیت سے بھارت اور پاکستان میں قتیل صاحب نے ایوارڈ پر ایوارڈ جیت کر اپنی خداداد صلاحیت کا بڑا زبردست لوہا منوایا۔ مجموعی طور پر انھوں نے 201 پاکستانی اور بھارتی فلموں کے گیت لکھے جو کہ ایک بہت بڑی تعداد اور ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کی تعداد 20 اور فلمی نغموں کی تعداد 2500 سے بھی زیادہ ہے۔

ان کی شاعری کے تراجم بہت سی دیگر زبانوں بشمول ہندی، گجراتی، انگریزی، روسی اور چینی زبان میں شائع ہو کر ان کی عظمت اور مقبولیت پر مہر ثبوت ثبت کر چکے ہیں۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے بین الاقوامی سطح کے نابغہ روزگار شہرہ آفاق سخنوروں میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی اور شعری عظمت و خدمات کے

اعتراف میں حکومت پاکستان نے 1994 میں انھیں "تمغہ حسن کارکردگی" سے نوازا جب کہ انھیں وطن عزیز میں " آدم جی ادبی ایوارڈ "نقوش ایوارڈ اور بھارت میں "امیر خسرو" ایوارڈ جیسے عظیم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1970 میں قتیل شفائی نے اپنی مادری زبان "ہندکو" کی پہلی فلم "قصہ خوانی" پروڈیوس کی جو 1980 میں ریلیز ہوئی۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری کی ناقابل فراموش خدمات انجام دینے کے اعتراف میں قتیل شفائی کو 1999 میں "صدی کے خصوصی نگار ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا۔ لاہور میں ان کی رہائش گاہ والی گلی کا نام "قتیل شفائی اسٹریٹ "جب کہ ہری پور میں ان کے محلے کا نام ان کے نام پر "محلہ قتیل شفائی" رکھ دیا گیا ہے۔ (جاری ہے۔)

نابغہ روزگار قتیل شفائی (۲)

ہمارے ممدوح کا اصل نام محمد اورنگزیب تھا لیکن انھیں شہرت عام اور بقائے دوام ان کے تخلص اور قلمی نام "قتیل شفائی" سے ہی حاصل ہوئی، جس کے نتیجے میں دنیا انھیں محمد اورنگزیب کے نام سے جاننے کے بجائے قتیل شفائی کے نام سے پہچانتی اور مانتی ہے۔ یہ قلمی نام انھوں نے 1938 میں اختیار کیا تھا جس نے ان کی شہرت کو بام عروج پر پہنچا کر لافانی بنا دیا ہے۔

قتیل صاحب نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شاعری میں تو خوب پیروی کی لیکن تخلص کی تبدیلی میں ان کی تقلید سے صریحاً انحراف کیا۔ مرزا غالب کو شاعری سے زیادہ اپنے آبا کے پیشہ سپہ گری پر ناز تھا حالانکہ انھیں تمام شہرت ان کی شاعری ہی کی بدولت حاصل ہوئی۔ قتیل شفائی کا گھرانہ ایک عام سے تاجر کا گھرانہ تھا، جس میں دور پرے کا بھی کوئی شخص شاعرانہ ذوق تو کجا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، مگر قتیل شفائی صاحب اس بات کے معترف رہے۔ شاعری نے ہی ان کے گھر کا چولہا بھی گرم رکھا اور اسی نے ہی ان کا نام بھی روشن کیا۔

1935 میں ان کے والد کی وفات کے بعد جب گھر کی کفالت کا بار ان کے کاندھوں پر آن پڑا تو حالات کے جبر کے تحت قتیل صاحب کو اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے کھیلوں کے سامان کی فروخت کا کاروبار شروع کرنا پڑا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ جس کے بعد انھوں نے راولپنڈی شہر کا رخ کیا جہاں وہ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی سے منسلک ہو گئے لیکن ناکامی نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ انجام کار 1946 میں وہ لاہور سے 1936 سے شایع ہونے والے ماہانہ "ادب لطیف" کے مدیر نذیر احمد کے اصرار پر اس ادبی رسالے کے نائب مدیر کے طور پر وابستہ ہو گئے بالآخر انھوں نے 1947 میں بہ حیثیت نغمہ نگار لاہور کی فلم انڈسٹری سے وابستگی اختیار کر لی۔ گویا" پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا" فلمی دنیا انھیں بہت راس آئی اور بس پھر تاحیات وہ اس کے ہو کر رہ گئے۔

ہمارے ساتھ ریڈیو پاکستان کی ہندی سروس کے لیے انٹرویو کے موقعے پر آف دی ریکارڈ غیر رسمی بے تکلف گفتگو کے دوران قتیل شفائی نے شدید ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ وہ اس بات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں گے کہ الیکٹرانک میڈیا سے نشر کیے جانے والے فلمی نغموں کی رائلٹی کی ادائیگی کا کوئی معقول نظام رائج نہیں جو نغمہ نگار، گلوکار اور سنگیت کار کے ساتھ سراسر حق تلفی اور ظلم ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے برملا اور برجستہ اپنا یہ مشہور شعر پرزور انداز میں پڑھا:

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی

جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

جب ہماری ترقی کے بعد ہمیں حیدرآباد میں ریڈیو پاکستان کا اسٹیشن ڈائریکٹر تعینات کیا گیا تو گویا سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ اس وقت صوبہ سندھ میں لسانی محاذ آرائی کی وجہ سے حیدرآباد شہر میں بھی کشیدگی اپنے عروج پر تھی جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سندھی زبان کی اپنی مادری و قومی زبان اردو کی طرح بے لوث خدمت اور آبیاری کرنے والے عظیم شاعر، ادیب، دانشور اور تعصب سے ناآشنا ریڈیو پاکستان، حیدرآباد کے سابق اسٹیشن ڈائریکٹر، جناب الیاس عشقی کو قاسم آباد سے نقل مکانی کر کے لطیف آباد میں مقیم ہونے کے لیے مجبور ہونا پڑا تھا۔ ہمارا مسئلہ بھی یہی تھا کہ لفظ تعصب ہماری ڈکشنری میں کبھی بھی شامل نہیں رہا۔ چنانچہ ہماری مشکل یہ تھی کہ بقول شاعر:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا

اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

مگر دنیا انسان دوست اور امن و آشتی پسند دوستوں سے چونکہ کبھی خالی نہیں رہی اس لیے ہم نے اپنے ہم خیال اور مخلص دوستوں کے تعاون سے شہر حیدرآباد کی فضا کو خوشگوار اور پرامن بنانے کا قصد کیا اور کمشنر حیدرآباد جناب عبدالغفار سومرو، وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی جی الانہ، سرگرم رکن فاران کلب حیدرآباد جناب نذر محمد قریشی، انجینئر و سماجی کارکن کے تعاون سے ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے زیر سایہ کل پاکستان عظیم الشان بین الصوبائی اور کل لسانی محفل مشاعرے کا ڈیال ڈاس

کلب حیدرآباد میں انعقاد کیا جس کے مہمان خصوصی جنرل (ر) معین الدین حیدر، گورنر سندھ اور صدر مشاعرہ محترم قتیل شفائی صاحب تھے۔

اس خاکسار کی دعوت پر قتیل صاحب نے نہایت عنایت و شفقت کے ساتھ لبیک کہا اور یوں ہمیں اپنے ممدوح کے ساتھ چند یادگار گھڑیاں گزارنے کا بہانہ اور سنہری موقع میسر آیا۔ اس وقت ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ قتیل شفائی سے یہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ اس مختصر سے قیام کے دوران نہ صرف بہت سی دل کی باتیں بھی ہوئیں اور قتیل صاحب کی زندگی اور شخصیت کے بہت سے گوشے بھی وا ہوئے۔ قتیل بہت ہشاش بشاش اور صحت مند تھے۔ خوش مزاجی، سادگی، ملنساری، پابندی سے ورزش اور کوئی غم نہ پالنا ان کی صحت اور طویل عمری کا راز تھا۔ شان بے نیازی ان کی شخصیت کا بنیادی وصف تھا۔ سرور بارہ بنکوی کا یہ شعر قتیل کی عظیم شخصیت کی ترجمانی و عکاسی کرتا ہے:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ

آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

قتیل صاحب ہو بہو ایسے ہی تھے۔ خلیق و شفیق، مرنجان مرنج اور درویش صفت۔ ان سے ملاقات میرا گرانقدر سرمایہ حیات ہے۔ قتیل صاحب نے اپنی علمی اور فلمی شاعری سے ادبی اور فلمی دنیا میں ایک دھوم مچا دی۔ انھیں خواص و عوام میں یکساں پذیرائی اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے دنیائے سخن میں اپنا ایک انوکھا اور منفرد مقام پیدا کیا۔ وہ اپنے اسلوب اور لب و لہجے کی بنا پر اپنی علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے علمی اور فلمی دنیا کو ایک نئے انداز اور آہنگ سے روشناس کرایا جو حسن بیان اور غنائیت کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ نغمگی اور موسیقیت ان کے کلام کا جوہر خاص اور اصل روح ہے جو سننے والے کے دل کو موہ لیتی ہے۔

دھن چونکہ ان کی شاعری کے خمیر میں شامل ہوتی ہے اس لیے کمپوزر کو ان کے تخلیق کیے ہوئے نغموں کی طرز بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ گلوکار یا گلوکارہ کی سریلی آواز سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ نئے کلام کو دوآتشہ بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اقبال بانو جیسی سریلی گلوکارہ کی آواز نے ان کے کلام کو چار چاند لگا دیے جس میں "الفت کی نئی منزل کو چلا"، "پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ" اور "حسن کو

چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں" جیسے جادو بھرے سدابہار شاہکار شامل ہیں جنھوں نے نہ صرف پاکستان میں دھوم مچا دی بلکہ پڑوسی ملک بھارت میں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر دیے اور لتا منگیشکر جیسی نابغہ روزگار گلوکارہ کو بھی خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور کر دیا۔

قتیل شفائی کی شاعری شعری محاسن سے معمور اور انداز بیاں کی نزاکتوں سے بھرپور ہے جسے بار بار سننے اور پڑھنے کے بعد بھی تشنگی میں کمی آنے کے بجائے مزید اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ انگریزی کے ممتاز شاعر جون کیٹس نے اس حوالے سے کیا خوب کہا ہے کہ: "A thing of beauty is a joy forever" ترجمہ: ایک حسن کا شاہکار سدابہار مسرت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔" مثال کے طور پر قتیل صاحب کے یہ لازوال اشعار ملاحظہ فرمائیں اور داد پر داد دیتے چلے جائیں:

حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں

ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

☆☆

گرمیٔ حسرت ناکام سے جل جاتے ہیں

ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

جب بھی آتا ہے ترا نام مرے نام کے ساتھ

جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

قتیل شفائی ایک قادرالکلام شاعر تھے جنھیں صرف غزل گوئی اور نغمہ نگاری ہی پر نہیں بلکہ دیگر اصناف سخن مثلاً دوہانگاری، نظم گوئی، قطعہ نگاری اور مزاحیہ شاعری پر بھی یکساں عبور حاصل تھا۔ نمونے یا تبرک کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں اور داد دے کر خراج تحسین پیش کریں:

مزاحیہ کلام

پولیس

اب پولیس بیٹھ جا وہاں جا کر

سارا فتنہ جہاں سے اٹھتا ہے

چرس کی بُو تجھے بتا دے گی

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

☆☆

قطعہ

بڑا منصف ہے امریکا اسے اللہ خوش رکھے

بزعم خویش وہ سب کو برابر پیار دیتا ہے

کسی کو حملہ کرنے کے لیے دیتا ہے میزائل

کسی کو ان سے بچنے کے لیے راڈار دیتا ہے

میاں محمدؒ بخش کی یاد میں (۲)

سن 1298 میں اپنے بڑے بھائی کے وصال کے بعد آپ نے سجادہ نشینی سنبھالی اور اپنی روحانی اور صوفیانہ شاعری کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے آپ نے لاکھوں مسلمانوں کی راہنمائی فرمائی اور غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا۔

ایک روز بعد نماز عصر آپ جب وظائف میں مشغول تھے کہ اچانک آپ پر فالج کا جان لیوا دورہ پڑا جس کے بعد آپ ایک دن اور ایک رات بے ہوشی کی حالت میں رہنے کے بعد 7 ذی الحج 1324 بمطابق جنوری 1907 اس جہان فانی سے رخصت ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ہر سال جب ماہ جنوری کی آمد ہوتی ہے حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ روحانیت کے انتہائی بلند درجے پر فائز ایک نابغہ روزگار صوفی شاعر تھے جنھوں نے پنجابی زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بنا کر اسلام کا آفاقی پیغام عوام الناس تک انتہائی موثر انداز میں پہنچایا اور دین اسلام کی پورے خلوص کے ساتھ ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے۔ شاعری آپ کا اصل ذریعہ اظہار تھی حتیٰ کہ آپ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خط بھی شاعری میں ہی لکھا کرتے تھے۔ آپ کے کلام میں دریا کی سی روانی اور معنی کا ایک سمندر موجزن ہوتا تھا۔ آپ صاحب کشف و کرامات تھے اور آپ سے بہت سی کرامات منسوب ہیں۔ آپ نے کسی سائل کو اپنے در سے کبھی خالی نہیں بھیجا۔

پنجابی کے علاوہ آپ اردو اور فارسی پر بھی بے پناہ عبور رکھتے تھے۔ آپ کے اشعار گوہر آبدار کی طرح درخشاں و تاباں ہوتے تھے۔ جب سیف الملوک کی تصنیف ہوئی اس وقت میاں محمد بخش کی عمر 33 سال تھی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے جو کچھ بھی اس قصہ سیف الملوک میں تحریر کیا ہے اس پر خوب دھیان دینا اور غور کرنا۔ اگر کوئی انسان خود اچھا ہے تو وہ دوسروں کو بھی اچھا ہی سمجھتا ہے اور اچھے لوگوں کا کام دوسروں کے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا ہے نہ کہ اچھالنا۔ فقرا کا کام تو فرمان رسولؐ پر عمل کرنا ہے کہ "دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالو کیونکہ یہی بات اللہ تعالیٰ عزوجل کو پسند ہے۔"

عاشق کو تو صرف اور صرف اپنے محبوب میں اچھائیاں ہی اچھائیاں نظر آتی ہیں۔ اگر سچے خدا نے میرے کلام کو روشنی بخشی تو میرا کلام ہمیشہ کے لیے یادگار بن جائے گا۔

قصہ سیف الملوک رمضان المبارک کے موسم بہار میں تالیف ہوا ہے اور اس وقت میری عمر 33 برس ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پڑھنے اور سننے والوں کو ذوق وشوق عطا کرے اور وہ میرے حق میں دعائے خیر ضرور کریں کیونکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے مستجاب الدعوات لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ عزوجل اپنے کسی نیک بندے کی دعا قبول فرما دیں۔ وہ کہتے ہیں :

انس اولاد تاڑی بھائی پڑھسن بیٹھ قبر تے

اٹھویں روز دیون گے گلی جے کچھ گھر وچ ورتے

مینوں ہور نہیں کوئی پاسا آسا کس دے گھر تے

جاسی روح محمد میرا پیر سچے دے در تے

ترجمہ: میرا نہ تو کوئی گھر نہ ٹھکانہ ہے اور نہ ہی مجھے کسی کے گھر کی آس مراد ہے۔ اے محمد بخش! میں نے اور کہاں جانا ہے کیونکہ میری روح تو میرے پیر و مرشد کے در پر جائے گی۔ مراد یہ کہ میرا روحانی گھر اور ٹھکانہ تو میرے پیر و مرشد کا در ہی ہے۔

:میاں محمد بخش فرماتے ہیں کہ

ظاہر دل بکلائی کارن قصہ عشق مجازوں

اندر خانے خبراں دیسی فقرانواں دے رازوں

رمزاں نال پروتا سارا چاہیئے سمجھن ہارے

ہمت اگے مشکل آساں ہمت مرد نہ ہارے

ترجمہ: میں نے یہ قصہ بظاہر دل لبھانے کے لیے عشق مجازی میں بیان کیا ہے مگر یہ اندر سے فقرا کے خفیہ رازوں کی خبر دے گا۔ یہ سارا قصہ اسرار و رموز میں پرویا ہوا ہے۔ صرف سمجھنے والوں کی ضرورت ہے اور اس کا لب لباب یہ ہے کہ ہمت کے آگے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ انسان ہمت نہ ہارے۔

پروفیسر عنایت علی خان

جن کے دم سے تھی بزم کی رونق

ہائے وہ لوگ اٹھتے جاتے ہیں

پروفیسر عنایت علی خان بھی ملک عدم روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی اکبر الہ آبادی کی قائم کردہ طنز و مزاح کی شاعری کا ایک اہم ستون زمیں بوس ہوگیا۔ مرحوم نہ صرف معیاری مزاحیہ شاعری کے تاجدار تھے بلکہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے بھی شاہکار تھے۔ ان کی رحلت سے محفل شعر و سخن سونی ہو گئی۔

موصوف ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ شگفتہ مزاجی اور وضع داری ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ انھوں نے 13 اپریل 1935 کو برٹش انڈیا کے دور کی ریاست ٹونک میں آنکھ کھولی۔ نومبر 1948 کو وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے بھارت سے پاکستان چلے آئے۔ حسن اتفاق سے یہ بقر عید کا دن تھا جب 13 اکتوبر 1948 کو ان کے خاندان نے سندھ کے شہر حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔ حیدرآباد میں ہی انھوں نے تعلیم حاصل کی اور وہیں سے انھوں نے 1955 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے تلاشِ معاش کا آغاز کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی سٹی کالج حیدرآباد میں شام کی کلاسوں میں پڑھائی بھی شروع کردی۔

انھوں نے 1957 میں انٹر اور 1959 میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں انھوں نے سندھ یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے 1961 میں اول پوزیشن کے ساتھ اردو ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ تدریس کے حوالے سے انھوں نے بی ایڈ کا امتحان پاس کرکے اپنے علمی سفر میں ایک اور سنگ میل عبور کیا اور 1963 میں مغربی پاکستان کی حکومت میں سرکاری ملازمت اختیار کی جہاں ان کی پہلی پوسٹنگ خیرپور میں ہوئی اور پھر ان کا تبادلہ حیدرآباد ہوگیا۔

انھوں نے کچھ عرصے پنجاب کے شہر گجرخان میں بھی خدمات انجام دیں۔ پروفیسر اے اے فاروقی کے اصرار پر انھوں نے بالآخر 1966 میں کیڈٹ کالج پٹارو میں شمولیت اختیار کرلی۔ کرکٹ کے کھیل سے عنایت علی خان صاحب کو بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے کیڈٹ کالج پٹارو میں طالب علموں کو اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ کرکٹ کی کوچنگ کا فریضہ بھی انجام دیا۔ کرکٹ ورلڈ کپ 1992 کے حوالے سے ان کی انتہائی مقبول نظم کا یہ مصرعہ ہماری طرح آج بھی بہت سے شائقین کرکٹ کے کانوں میں گونج رہا ہے:

ذرا یہ ورلڈ کپ ہولے پھر اس کے بعد دیکھیں گے

کیڈٹ کالج پٹارو میں ان کا عرصۂ تدریس انتہائی مختصر تھا جو 1969 تک جاری رہا جس کے بعد انھوں نے جماعت اسلامی کے اصرار پر سکھر میں "تعمیر نو" اسکول میں بحثیت مدرس شمولیت اختیار کی۔ 1970 کے قومی انتخابات کے موقع پر انھوں نے جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر انتخاب بھی لڑا، لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔

1971 میں انھوں نے غزالی کالج حیدر آباد میں پرنسپل کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا لیکن ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کی تعلیمی اداروں کو قومیانے کی پالیسی کے تحت وہ سیاست کا شکار ہو کر اپنے عہدے سے فارغ ہوگئے جس کے بعد مسلم کالج حیدرآباد سے وابستہ ہوگئے۔ عنایت صاحب نے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کے زیر انتظام کئی درسی کتابیں بھی تحریر کیں مگر ان کی اصل وجہ شہرت ان کی لافانی شاعری ہے جس کی بنا پر وہ ہمیشہ اپنے بے شمار چاہنے والوں کے ذہنوں اور دلوں میں زندہ رہیں گے۔ اگرچہ انھوں نے دیگر اصناف میں بھی اپنا لوہا منوایا لیکن ان کے نام کا ڈنکا ان کی مزاحیہ شاعری نے ہی بجوایا۔ وہ جو مرزا غالب نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

وہ پروفیسر عنایت علی خان صاحب پر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔ ان کا کلام اور ان کا اندازِ بیان انھی کا حصہ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے پسماندگان کے

علاوہ اپنے بعد اپنی شاعری کی پانچ یادگار کتابیں چھوڑی ہیں جن میں ازراہِ عنایت، عنایات، عنایات نامہ، عنایتیں کیا کیا، کلیاتِ عنایات شامل ہیں۔

اس موقع پر ہمیں حیدرآباد اور خیرپور کے وہ مشاعرے یاد آرہے ہیں جن میں ہم بحیثیت شاعر ان کے ہم رکاب تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ ہمیں ہی نہیں بلکہ ساکنانِ حیدرآباد کو ریڈیو پاکستان حیدرآباد سندھ یونیورسٹی اور فاران کلب حیدرآباد کے باہمی اشتراک سے 12 جولائی 1997 کو دیال داس کلب حیدرآباد میں منعقدہ وہ عظیم الشان مشاعرہ ضرور یاد رہے گا جس کی صدارت قتیل شفائی نے فرمائی تھی اور جس کے مہمان خصوصی اس وقت کے گورنر سندھ جنرل معین الدین حیدر صاحب تھے۔ اس مشاعرے کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پاکستان کے علاقائی زبانوں کے معروف شعرا نے بھی اپنا کلام پیش کیا تھا۔

عنایت علی خان صاحب نہ صرف پیدائشی شاعر تھے بلکہ شاعری ان کے خون میں شامل تھی۔ ان کے والد ہدایت علی خان ٹونکی اپنے دور کے مشہور شاعر شمار کیے جاتے ہیں۔ اسی کے علاوہ ان کے نانا، دادا اور چچا جان بھی عمدہ شعر کہتے تھے گویا "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"۔ پروفیسر عنایت علی خان کراچی سے شایع ہونے والے جمعیت پنجابی سوداگران دہلی کے ترجمان ماہنامہ "سوداگر" کی مجلسِ مشاورت کے اہم رکن بھی تھے۔ اس ماہنامے کے تازہ ترین شمارے جون/جولائی 2020 میں شایع ہونے والی ان کی خوبصورت نظم بعنوان "کشمیر کی فریاد" سے ایک اقتباس پیش ہے:

ارضِ کشمیر سے آتی ہے یہ دلدوز صدا

اے خدا! اب تو کسی یار و مددگار کو بھیج

اپنی رودادِ الم جا کے سناؤں کس کو؟

زخمِ دل داغِ جگر جا کے دکھاؤں کس کو

اور یہ حالِ زبوں جا کے بتاؤں کس کو

کس کو آواز دوں نصرت کو بلاؤں کس کو

اے خدا! اب تو کسی یار و مددگار کو بھیج

پروفیسر عنایت علی خان نے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اتوار 26 جولائی کو کراچی میں وفات پائی، جہاں وہ اپنے صاحبزادے کے پاس علاج کی غرض سے مقیم تھے۔ دل کا دورہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور ماڈل کالونی کے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون۔) حق تعالیٰ ان کی مغفرت اور درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین!)

خدا بخشے کہ کیا کیا خوبیاں تھیں مرنے والے میں

فخرِ انبیاء، وجہِ تخلیقِ کائنات

ہمارے پیارے نبی ﷺ خیر البشر، فخرِ انبیاء، سرورِ دوجہاں اور وجہِ تخلیقِ کائنات ہیں۔ آپ ﷺ حبیبِ خدا اور محبوبِ کبریا کے القاب سے اپنی منفرد، مخصوص اور بے مثل شناخت سے مشرف ہیں۔ آپ ﷺ کا ذکر رب العالمین نے خود بلند فرمایا ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ "میرا نام زمین پر محمد ﷺ اور آسمان پر احمد ﷺ رکھا گیا ہے۔ محمد ﷺ کے معنی ہیں وہ ذاتِ گرامی کہ جس کی تعریف اللہ تعالیٰ بذاتِ خود بیان فرمائے اور احمد ﷺ وہ ہے کہ جو حق تعالیٰ کی حمد وثناء کا شرف رکھنے کا حامل انسانِ کامل ہو۔ فرمانِ الٰہی ہے کہ "اے حبیب ﷺ ہم نے تمہاری خاطر تمارا ذکر بلند کر دیا" ذکرِ محمد ﷺ عبادتِ الٰہی کا جزو لاینفک ہے اور رضائے خدا مصطفی ﷺ سے وفاداری کے ساتھ مشروط ہے جس کا اظہار علامہ اقبال نے اپنے درج ذیل شعر میں نہایت خوب صورت انداز میں کیا ہے :

کی محمد ﷺ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

حضورِ اکرم ﷺ کے آخری نبی ہونے پر پختہ اور غیر متزلزل یقین اور اس کا تہہ دل سے ببانگِ دہل واضح الفاظ میں اعتراف مومن کی شان اور پہچان ہے۔ باالفاظِ دیگر مومن کے ایمان کی یہی اصل کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر کھرے اور کھوٹے کا فرق معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے یہ خوش خبری انتہائی حوصلہ افزا اور لائق تحسین ہے کہ گزشتہ دنوں قومی اسمبلی نے مکمل اتفاقِ رائے سے منظور کی گئی ایک تاریخ ساز قرارداد کے ذریعے تمام نصابی کتابوں میں سرکارِ دوعالم حضرت محمد ﷺ کے اِسمِ مبارک کے ساتھ خاتم النبیّین لکھنا لازم قرار دے دیا ہے۔ اس مبارک تاریخی قرارداد کو تجویز کرنے کا شرف مسلم لیگ (ن) کے رکنِ قومی اسمبلی نورالحسن کو حاصل ہوا جب کہ اسے پڑھ کر سنانے کی سعادت پی ٹی آئی کے وزیر مملکت علی محمد خان کو نصیب ہوئی۔ تمام پارلیمانی جماعتوں نے اس

مقدس قرارداد کی پُرزور حمایت کرکے خود کو عاشقانِ محمد ﷺ کی فہرست میں شامل کرالیا۔ اس حوالے سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ :

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ایوان بالا یعنی سینیٹ کے ارکان نے بھی اس قرارداد کو متفقہ منظوری دے کر عاشقانِ نبی ﷺ کی فہرست میں شامل کروا کر ثواب دارین حاصل کیا۔ پنجاب کی صوبائی اسمبلی نے بھی پیروی کرتے ہوئے ایسی ہی قرارداد کو مکمل اتفاق رائے سے منظور کرکے حضور پاک ﷺ سے بھرپور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

وطن عزیز کی قانون ساز اسمبلیوں کا یہ تاریخی کارنامہ قیامِ پاکستان کے مقاصد کے حصول کی راہ پر ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اقدام اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ قوم نے اپنا سبق بھلایا نہیں ہے اور یہ کہ اس کا جذبۂ ملّی سرد نہیں ہوا۔ بقولِ اقبال :

ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بڑی ذرخیز ہے ساقی

دینِ اسلام کی امتیازی خصوصیت خاتم الانبیاء حضور اکرم ﷺ کی شانِ رسالت میں مضمر ہے۔ رسالت ہی کی وجہ سے ملّت کے پیکر میں روح پھونکی گئی ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے ہمارا ملّی پیکر تیار فرما کر اس میں رسالتِ محمد ﷺ کی وجہ سے روح پھونکی۔ رسالت ہی کی بدولت بحثیت ملّت ہماری پیدائش ہوئی اور رسالت ہی کے طفیل ہمیں دینِ اور دستورِ حیات میسّر آیا۔ اقبال کے بقول :

از رسالت در جہاں تکوینِ ما

از رسالت دینِ ما آئینِ ما

علامہ اقبال مزید فرماتے ہیں کہ جہانِ عشق آپ ﷺ ہی کی وجہ سے زندہ ہے۔

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے

غُبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر

وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

حضور پاک صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی عظمت و شانِ رسالت ہی ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سرورِ دوجہاں رحمتہ اللعالمین، سردارِ انبیاء، محبوبِ کبریا، حبیب خدا اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قرآن پاک میں ربّ العزّت کا واضح فرمان ہے کہ محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا کیونکہ دین مکمل ہو چکا ہے۔ ختم نبوت کی حقیقت کو احمد ندیم قاسمی صاحب نے نہایت دلکش انداز میں شعری قالب میں ڈھالا ہے :

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی

اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ترجمہ: "میری اور سابقہ پیغمبروں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک گھر بنایا، اس کو خوب آراستہ و پیراستہ کیا مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس گھر میں پھرتے ہیں، تعجب کرتے ہیں کہ (ایسا آراستہ گھر) یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی۔ فرمایا" تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبّیین ہوں"۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ اس دین کے بعد نہ تو کسی اور دین کی اور نہ کسی اور پیغمبر کی ضرورت باقی ہے۔ پس اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین، قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری الہامی کتاب اور حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی یعنی خاتم النبّیین ہیں۔ نعت گو شعرائے کرام پر

یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی نعتوں میں عقیدہ ختمِ نبوت کو اجاگر کرتے رہیں۔ اس انتہائی اہم اور مقدس فریضہ کو ادا کرنے والوں میں جناب شہزاد مجددّی پیش پیش ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

کہا اللہ نے قرآں میں ختم المرسلیں ان کو

"عقیدہ اس لیے رکھتے ہیں ہم ختم نبوت کا "

"شہِ کونین ﷺ نے فرمادیا ہے "لا نبی بعدیٰ

" عقیدہ اس لیے رکھتے ہیں ہم ختمِ نبوت کا "

کسی کو اب کوئی جرأت نہ ہو پھر ایسے دعوے کی

" عقیدہ اس لیے رکھتے ہیں ہم ختمِ نبوت کا "

عقیدہ ختم نبوت ہر مسلمان کا لازمی جزو ایمان ہے۔ تاریخ اسلام کی اہم ترین جنگ "جنگِ یمامہ" اسی عقیدے کے دفاع کے لیے لڑی گئی تھی۔ یہ عظیم جنگ مسیلمہ کذاب کے جھوٹے دعوے کے نتیجے میں لڑی گئی تھی اور اس میں بارہ سو صحابہ کرام نے جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔

مولانا شاہ حکیم محمدؒ اختر کی یاد میں

جون کے مہینے کا آغاز نہ صرف پاکستان کے لیے بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک عظیم سانحہ سے عبارت ہے جب ہم نابغہ روزگار حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اخترؒ صاحب، شیخ العرب وعجم قدس سرہ کی رحلت کے صدمے سے دوچار ہوئے تھے۔

مسلسل طویل علالت کے بعد 2 جون 2013ء بروز اتوار بمطابق 22 رجب 1434ھ عصر کے بعد ان کی حالت نازک ہو گئی اور غروبِ آفتاب کے بعد جب پیر 23 رجب کی شب کا آغاز ہوا تو ان کی پاک روح اپنے قفس عنصری سے پرواز کر کے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ موت العالِم، موت العالَم!

اِس حقیر و فقیر اور بندہ ناچیز کو جب ان کے پیارے خلیفہ اور اپنے داماد سید غضنفر علی رضوی کے توسط سے حضرت والا کے دیدارِ پُر انوار کی سعادت نصیب ہوئی تو اس وقت آپ فالج کے حملے کے بعد بستر علالت پر خانقاہِ اشرفیہ، گلشن اقبال، کراچی کے کمرہِ مخصوص میں آرام فرما رہے تھے۔ نہایت پاکیزہ اور پُر نور زندگی کے تقریباً تیرہ سال آپ نے اسی حالت میں گزارے لیکن تادم آخر صبرِ ایوبی کا شاہکار اور راضی بہ رضا کی جیتی جاگتی تصویر بنے رہے۔ کیا مجال جو کبھی صبر کا پیمانہ ذرا سا بھی چھلکا ہو یا پائے استقامت میں لمحہ بھر کے لیے بھی لغزش آئی ہو۔ ہر حال میں راضی بہ رضا رہنا حضرت والا قدس سرہ کا طرہ امتیاز تھا۔ آپ کی پوری حیاتِ باصفات اسی وصف سے مزیّن تھی۔

زندگی ایک سفر ہے۔ اس سفر میں دو طرح کے لوگ شامل ہیں۔ ایک وہ جو اس سفر کو اپنے اوپر حاوی کر لیتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس سفر پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ یہ دوسرے والے لوگ ہی اصل میں کامیاب لوگ ہیں۔ ان لوگوں کی پوری زندگیاں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہی گزرتی ہیں اور انھیں دنیا داری میں الجھے ہوئے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی ذمے داری سونپی جاتی ہے۔ یہ غازی اور پُر اسرار بندے اللہ تعالیٰ کے دین مبین کی تبلیغ کے علاوہ ذکر الٰہی سے بھی سرشار رہتے ہیں۔

یہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ اپنے نفس کو کچل دینا اور خونِ تمنا کر کے فریبِ دنیا سے بچنا ہی عاقبت سنوارتے اور اپنے رب کو راضی رکھنے کا واحد راستہ ہے۔

چنانچہ زندگی بھر حضرت والا خود بھی اس پُرخار راستے پر نہایت ثابت قدمی سے گامزن رہے اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلنے کی تلقین فرماتے رہے۔ ان کے کلام میں بھی جابجا اسی پر زور ہے :

جس نے مرشد سے لیا خونِ تمنا کا سبق

اس کے دل میں ہمہ دم جلوہء جاناں پایا

خونِ ارماں سے دل کو رنگیں کر

میر رکھا ہے کیا نظاروں میں

جب ملا دردِ خونِ حسرت سے

کیا کہوں اس کا ذوقِ ایمانی

جس جگہ گرتا ہے خون آرزو

لے نہ لے بوسہ کہیں خود آسماں

حضرت حکیم صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم تھا کہ انھیں اپنے عہد کے تین مشائخ عظام کی طویل خدمت اور محبت میسر آئی جس نے انھیں پارس بنا دیا کہ اگر اس سے مٹی بھی چھو جائے تو سونا بن جائے۔ اول حضرت مولانا محمد احمدؒ صاحب پرتاب گڑھی، دوئم حضرت مولانا شاہ عبد الغنیؒ صاحب پھول پوری اور سوئم حضرت مولانا شاہ ابرار الحقؒ صاحب۔ ان تینوں اصحاب کا شمار میکدہ تھانویؒ کے سرکردہ بادہ خواروں میں ہوتا ہے۔ اپنے ان تینوں بزرگوں کی صحبت صالح کی جانب آپ نے درج ذیل شعر میں نہایت خوب صورت اشارہ فرمایا ہے :۔

کسی اہل دل کی صحبت جو ملی کسی کو اخترؔ

اُسے آگیا ہے جینا اسے آگیا ہے مرنا

شاہ صاحبؒ نے ساتویں جماعت تک ابتدائی تعلیم اُس زمانے کے دستور کے مطابق حاصل کی اور اسی کے بعد اپنے والد بزرگوار کے اصرار پر طبیہ کالج الہ آباد سے باقاعدہ طب کی تعلیم حاصل فرمائی۔ چونکہ آپ کا طبعی رجحان شروع ہی سے اسلامی علوم کی جانب تھا چنانچہ آپ نے فارسی زبان بھی تعلیم کے دوران ہی سیکھ لی تھی اور بہت جلد اس پر دسترس بھی حاصل کرلی۔ علمائے حق اور بزرگانِ دین کے مواعظ میں شرکت کا ذوق وشوق آپ کو بچپن ہی سے تھا اور دنیاداری سے بے رغبتی اور خلوت پسندی آپ کے خمیر میں شامل تھی جس کا اظہار اس شعر سے ظاہر ہے:

مری زندگی کا حاصل مری زیست کا سہارا

ترے عاشقوں میں جینا ترے عاشقوں میں مرنا

حضرت حکیم صاحبؒ قدس سرہ کی ذاتِ گرامی سالکینِ طریقت کے لیے سرچشمہ فیض تھی جس نے بے شمار لوگوں کی زندگیوں کا رخ تبدیل کر دیا اور اور ان کے تاریک دلوں کو نور حق سے منور کر دیا۔ اقبال نے ٹھیک ہی کہا ہے:

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دردِ دل کی دولتِ بے حساب و بے پایاں آپ کو خزانہ خداوندی سے عطا ہوئی تھی جسے آپؒ نے دریادلی کے ساتھ لوگوں میں آخری دم تک تقسیم فرمایا۔ اپنے شیخ ثانی حضرت شاہ ابرار الحقؒ صاحب قدس سرہ کے حکم کے مطابق حضرت والا نے خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ پہلے ناظم آباد اور پھر گلشن اقبال میں قائم کی جو دنیا بھر کے سالکین طریقت کے لیے مرکزِ ثقل بن گئی۔
حضرت حکیم صاحبؒ قدس سرہ کا درسِ مثنوی اس قدر مقبول ہوا کہ اس کی خوشبو چار دانگِ عالم میں پھیل گئی اور بعد میں اس کی اشاعت "معارفِ مثنوی" کے عنوان سے

ہوئی۔ اس کے بعد آپؒ نے خود مثنوی تصنیف فرمائی۔ آپ کی بہت ساری کتابوں کے تراجم عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ دنیا کی 23 زبانوں بشمول چینی، روسی زبانوں میں شایع ہو کر مقبولیت و پزیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

جس طرح امیر خسروؒ پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا رنگ چڑھا ہوا تھا اسی طرح حضرت حکیم صاحبؒ بھی سر تاپا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے انھوں نے اپنے مرکزِ فیض کا نام۔ "اشرف المدارس" رکھا۔ حکیم صاحبؒ کی مجالس کسی زاہدِ خشک کی مجالس نہیں ہوتی تھیں۔ ان پُر لطف مجالس میں اعلیٰ درجہ کی شاعری کا تڑکا لگا ہوا ہوتا تھا۔ ان مجالسِ بے بدل میں شعر و سخن کی آمیزش کے ساتھ ساتھ نہایت عمدہ مزاح المومنین کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ خود حضرت والاؒ کی منفرد بلند پایہ شاعری کی روح پرور خوشبو ان مجالس کو معطر کر دیتی تھی۔ ڈھاکا، بنگلہ دیش میں مقیم حضرت حکیم صاحبؒ کے اجل خلیفہ حضرت شاہ عبد المتین صاحب دامت برکاتہم کی روح پرور مجالس نہ صرف حضرت والاؒ کی یاد کو تازہ کر دیتی ہیں بلکہ سننے والوں کی روح کو بھی تر و تازہ کر دیتی ہیں۔

اگرچہ حضرت حکیم اخترؒ صاحب قدس سرہ آج ہمارے سروں پر سایہ فگن نہیں ہیں لیکن انھوں نے جو باقیات اور اپنے تربیت یافتہ افراد و ثمرات چھوڑے ہیں وہ ان کا انمول ورثہ ہیں :

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شُد بہ عشق

ثبت است بر جریدہء عالم دوامِ ما

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کو توفیقِ کامل اور جذبہ صادق عطا فرمائے اور دنیا داری و ظاہر داری سے باز اور محفوظ رکھے۔ آمین

جوہر قابل تو بہت سے لوگوں میں ہوتا ہے لیکن اسے دریافت کر کے بروئے کار لانا بھی جوہر شناس کا ہی کام ہوتا ہے۔احمد رشدی کی یہ خوش بختی تھی کہ انھیں ریڈیو پاکستان کراچی میں مہدی ظہیر جیسا جوہر شناس میسر آگیا جن کے لکھے اور کمپوز کیے ہوئے گانے ''بندر روڈ سے کیماڑی، چلی رے میری گاڑی، بابو ہو جانا فٹ پاتھ ''...(1954) کے بچوں کے پروگرام میں نشر ہوتے ہی احمد رشدی کی شہرت اور مقبولیت کو گویا پر لگ گئے۔اس سے قبل وہ پاکستان کے قومی ترانے میں بھی اپنی آواز ملا چکے تھے۔

پاکستان کی فلم انڈسٹری میں قدم رکھتے ہی انھوں نے اپنی منفرد آواز اور انداز کا جادو جگادیا،واقعی:

آواز وہ جادو سا جگاتی ہوئی آواز

انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پلے بیک گلوکاری کا سکہ جمادیا اور سلیم رضا اور میر حسین جیسے سینئر گلوکاروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ''کوکورینا'' والے ان کے فلمی نغمے نے پورے ملک میں دھوم مچادی۔1961 سے 1976 تک احمد رشدی نے پاکستان کی فلم انڈسٹری پر راج کیا اور وہ اس پر چھائے رہے۔ریڈیو پاکستان کے ہر اسٹیشن سے بس انھی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ''اک اڑن کھٹولا آئے گا'' والے ان کے مشہور گانے نے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔جو بھی اس گانے کو سنتا جھوم اٹھتا اور لہک لہک کر ناچنے لگتا۔ لیکن انھی احمد رشدی نے جب ایک افسردہ گانا'' جب رات ڈھلے '' گایا تو سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔سب حیران تھے کہ شوخ اور چنچل گانے گانے والا گلوکار احمد رشدی ایسا پر سوز نغمہ بھی گا سکتا ہے۔احمد رشدی کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک ورسٹائل گلوکار تھے۔

دو عشروں پر محیط مختصر عرصے میں احمد رشدی نے تقریباً1000 نغمے گائے جن میں سے زیادہ تر گانے انھوں نے وحید مراد کے لیے گائے جن کی تعداد 140 کے لگ بھگ ہے۔ فلم ''ہیرا اور پتھر'' سے لے کر آخری پروڈکشن ہیرو تک ان کی وابستگی کا یہ سلسلہ 1985 تک جاری رہا۔رشدی کے 80 سے زائد گانے فلم اسٹار ندیم پر فلمائے گئے۔ فلم ''دوبدن'' اور ''مسٹر بدھو'' میں ندیم نے رشدی کے ساتھ مل کر بھی گانے گائے۔پرانے فلمی اداکاروں میں رشدی کے گائے ہوئے نغمے سنتوش کمار،لالہ سدھیر اور علاؤالدین پر بھی فلمائے گئے۔انھوں نے سنتوش،درپن اور منصور براداران پر فلمائے گئے گانے بھی خوب گائے۔انھوں نے اپنے زمانے کے ابھرتے ہوئے اداکاروں غلام محی الدین، راحت کاظمی اور عثمان پیرزادہ کے لیے بھی بڑی اچھی پلے بیک Singing کی۔

احمد رشدی کو گلوکاری میں تاثرات کے اظہار پر عبور حاصل تھا۔اس وصف میں ان کا موازنہ محمد رفیع سے کیا جاسکتا ہے۔ فلم ''جب جب پھول کھلے ''میں ان کا گایا ہوا گانا'' بڑھاپے میں دل نہ لگانا'' کبھی نہ بھلایا جاسکے گا۔ یہ گانا وحید مراد اور ندیم پر فلمایا گیا جس میں وحید مراد نے نوجوان کا اور ندیم نے بوڑھے کا کردار ادا کیا تھا۔احمد رشدی کا کمال یہ تھا کہ اس گانے میں اس نے نوجوان اور بوڑھے کے تاثرات کا عکس اپنی آواز کے ذریعے بڑے کمال کے ساتھ پیش کیا تھا۔

رچی بینو کی یاد میں

گزشتہ 10 اپریل کو موت نے عالمی شہرت یافتہ آسٹریلوی کرکٹ کھلاڑی رِچی بینو(Richie Benaud) کو ان کے بے شمار پرستاروں سے چھین کر اپنے پنجہ ستم میں دبوچ لیا تو ہمیں T.S Eliot کا یہ قول یاد آگیا کہ اپریل کا مہینہ بڑا ظالم ہوتا ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبال بھی اسی ماہ کی 21 تاریخ کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ رچی بینو جیسے عظیم کھلاڑی روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

رچی بینو ایک پیدائشی کرکٹر تھے اور لیگ اسپن بولنگ ان کی گھٹی میں شامل تھی جو انھیں ان کے والد ٹوئس بینو سے ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز 25 جنوری 1952 کو ویسٹ انڈیز کی ٹیم کے خلاف میچ کھیل کر کیا تھا جب کہ ان کے ٹیسٹ کیریئر کا اختتام 12 فروری 1964 کو جنوبی افریقہ کے خلاف کھیلے گئے میچ کے ساتھ ہوا تھا۔ ٹیسٹ کرکٹ کے آغاز سے پہلے وہ 1948 سے 1964 تک نیو ساؤتھ ویلز کی ٹیم کی طرف سے ڈومیسٹک کرکٹ کھیلتے رہے۔

انھوں نے 1958 سے 1964 میں اپنی ریٹائرمنٹ تک آسٹریلوی ٹیسٹ ٹیم کی کپتانی کی۔ انھوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں 200 وکٹیں حاصل کرنے اور 2000 رنز اسکور کرنے والے دنیا کے پہلے کھلاڑی ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں یہ ایک سنگ میل تھا۔ سری لنکا کے کرکٹ رائٹر ہیر یلڈ ڈی اینڈ راؤ کے بقول "رچی بینو سر ڈان بریڈ مین کے بعد آسٹریلیا کے عظیم ترین کرکٹ کھلاڑی تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک عظیم کھلاڑی ہونے کے علاوہ بلند پایہ محقق، لکھاری، نقاد، اتھارٹی، مصنف، آرگنائزر اور ایڈوائزر بھی تھے۔ اس حوالے سے اگر انھیں ہمہ صفت موصوف کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

رچی بینو 1930 میں پین رتھ (Penrith) نیو سائوتھ ویلز میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک کرکٹر گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی جون بینو بھی آسٹریلین ٹیسٹ کرکٹر تھے۔ رچی آسٹریلیا کے واحد کرکٹ کھلاڑی تھے جنھیں برطانیہ کی طرف سے او۔ بی۔ ای کے شاہی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ سے بلے بازی اور لیگ اسپین بولنگ کرنے والے مایہ ناز آل راؤنڈر تھے۔

1964 میں کرکٹ کے کھیل سے ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے بحیثیت کمنٹیٹر اپنے نئے کیریئر کا آغاز کیا اور اس میں بھی اپنے اختصاص کو برقرار رکھا اور نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کی وفات سے دنیائے کرکٹ نہ صرف ایک عظیم آل راؤنڈر سے بلکہ ایک بے لاگ کرکٹ مبصر سے محروم ہو گئی۔ ان کے لہجے کی مٹھاس، الفاظ کے انتخاب اور انداز بیاں کو سامعین کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بقول غالب:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

"Morning Everyone" کے الفاظ سے ان کے "ان کی مدھر آواز سننے والوں کے کانوں میں رس گھولتی تھی۔ منفرد انداز تخاطب کو بھلا کون فراموش کر سکتا ہے۔ ان کی یہ رس بھری آواز ان کے مداحوں کے دل نصف صدی تک لبھاتی رہی۔ آواز، وہ جادو سا جگاتی ہوئی آواز۔ پی بی شیلی کی خوبصورت نظم میوزک وین سوفٹ وائسز ڈائی (Music when soft voices die) اس موقع پر یاد آرہی ہے۔ رچی بینو 84 سال کی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ کرکٹ کی ترقی اور فروغ ان کی زندگی کا مشن تھا۔ افسوس کہ وہ ورلڈ سیریز کرکٹ پروجیکٹ کو مکمل کرنے سے پہلے ملک عدم سدھار گئے۔ مائیکروفون ان کی رخصتی کے بعد ان کی آواز کو ترستا ہی رہے گا اور ان کے ہم عصر ان کی عدم موجودگی کو سدا محسوس کرتے رہیں گے۔

رچی بینو کرکٹ میں اتھارٹی کا درجہ رکھتے تھے لیکن ان کی انکساری نے اسے کبھی بار خاطر نہیں ہونے دیا۔ پہلے تولنا اور پھر بولنا ان کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا۔ مجال نہیں کہ بلا ضرورت کبھی ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نکلا ہو۔ ان کا ذوق مزاح بھی انھی کا حصہ تھا۔ کرکٹ کمنٹری پر انھیں مکمل عبور حاصل تھا۔ بحیثیت بولر انھوں نے اپنے بعد آنے والے کھلاڑیوں پر گہرے اثرات مرتب کیے جن

میں آسٹریلیا کے مشہور باؤلر شین وارن سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے 63 ٹیسٹ میچ کھیلے اور 248 وکٹیں حاصل کیں اور 2201 رنز اسکور کیے۔

کرکٹ کے میدان میں بحیثیت کپتان ان کا ایک منفرد انداز تھا۔ ان کی شرٹ کے بٹن ہمیشہ کھلے رہتے اور سر بھی کرکٹ کیپ کے بغیر ہوتا۔ بحیثیت کپتان ان کا انداز ہمیشہ جارحانہ رہا۔ وہ اپنی زندگی میں ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قسمت ہمیشہ حوصلہ مند کا ساتھ دیتی ہے یعنی ہمت مرداں مدد خدا۔ ان کی وفات پر یہ شعر فضا میں گونج رہا ہے:

لوگ اچھے ہیں بہت دل میں اتر جاتے ہیں

اک برائی ہے تو بس یہ ہے کہ مر جاتے ہیں

کرکٹ جو کبھی لارڈز کا گیم ہوا کرتا تھا اب یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ پانچ روزہ ٹیسٹ میچ کی منزل سے گزر کر اب تک آ پہنچی ہے۔ کیری پیکر نامی بازی گر نے اس کی کایا ہی پلٹ ڈالی۔ اب کرکٹ کھیل سے زیادہ کاروبار بن چکا ہے جس میں شہرت کے علاوہ بے تحاشا دولت بھی ہے۔ سو کوئی بعید نہیں کہ کسی روز آپ کو اس وقت اپنے کانوں پر یقین نہ آئے جب آپ کو اچانک یہ سنائی دے کہ:

T-20 نوبت ون ڈے اور اس کے بعد

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے

چلے بھی آؤ کہ کرکٹ کا کاروبار چلے

کرکٹ کے کھیل کی انقلابی تبدیلیوں نے عاشقی کے مزاج کو بھی تبدیل کر دیا ہے۔ جو قاتل حسینائیں پہلے

فلمی ہیروز کی دیوانی ہوا کرتی تھیں اب وہ نذرانہ دل کرکٹ ہیروز کو پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

درود اُن پر، سلام اُن پر

زندگی کے سفر میں ہمیں بہت سے لوگ ملتے ہیں مگر دائمی رشتے صرف چند ہی لوگوں کے ساتھ قائم ہوتے ہیں، ایجاب وقبولیت کا یہ دلچسپ فطری عمل کسی شعوری کوشش کے تابع نہیں ہوتا۔ یہ ایک خودکار عمل ہے جسے حسن اتفاق یا "وارداتِ قلب" کہا جاتا ہے۔

سید محمد حسن زیدی جوائنٹ سیکریٹری (ر) حکومت پاکستان، مابدولت، کنٹرولر وا سٹیشن ڈائیریکٹر (ر) ریڈیو پاکستان، عزیز احسن، ڈپٹی چیف انٹرن آڈٹ، او۔ جی۔ ڈی۔ سی۔ اور ریاض السلام المتخلص عرشؔ ہاشمی، جوائنٹ سیکریٹری (ر) حکومت پاکستان پر مشتمل چاروں یاروں کی چوکڑی بھی وارداتِ قلب ہی کا ثمر ہے۔ ہماری اس بے لوث دوستی کے اٹوٹ بندھن میں حُبِ نبی ﷺ کے حوالے سے نعت گوئی کو قدرِ مشترک کا درجہ حاصل ہے۔

قبل اس کے کہ حال ہی میں شائع ہونے والے عرشؔ ہاشمی کے تازہ ترین اور نہایت خوبصورت دل کش ودیدہ زیب مجموعہ نعت بعنوان "دُرود اُن پر، سلام اُن پر" کے بارے میں اظہارِ خیال کیا جائے، چند کلمات نعت اور نعت گوئی کے حوالے سے عرض ہیں۔ نعت وہ نازک اور انتہائی مقدس صنفِ سخن ہے جس کا مقصد اس ذاتِ والاصفات ﷺ کی مدح کرنا ہے، جس کی خاطر خدائے بزرگ وبرتر نے یہ کائنات تخلیق کی ہے اور جنھیں سرور کائنات ﷺ اور حبیبِ کبریا ﷺ جیسے القابات سے متصف کیا گیا ہے۔

لہٰذا اس ذاتِ اقدس کی ثناء خوانی کا شرف بھی صرف انھی خوش بختوں کو نصیب ہوتا ہے جو حُبِ نبی ﷺ سے سرشار ہوں اور منتخبِ پروردگار ہوں۔ ماشاء اللہ عرشؔ بھائی گفتار وکردار اور صورت وسیرت شعر وسخن پہ قدرت اور زبان وبیان پر قدرت، غرضیکہ ہر اعتبار سے نابغہ روزگار ہیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ آقائے دوجہاں ﷺ کے سچے پیروکار اور وفا شعار ہیں۔ سورب کریم نے انھیں دین اور دنیا دونوں کی دولت سے خوب نوازا ہے۔ موصوف بلاشبہ ہاشمی گھرانے کا روشن چراغ کہلانے کے پوری طرح حقدار ہیں۔

عرشؔ ہاشمی کا طرہ امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری بلکہ اپنی زندگی، نعت اور فروغِ نعت کے لیے وقف کر دی ہے۔ عشقِ نبی ﷺ میں ڈوبے ہوئے ان کی زندگی کے معمولات اس حقیقت پر مہر ثبوت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی ایک نعت کا یہ شعر ان کی سوچ اور طرزِ عمل کا ترجمان ہے۔

نہ عمر بھر میں ہو کوئی لمحہ کہ سامنے ہو نہ اُن کا اُسوہ

یہ زندگی ان کے نام کیجیے، دُرود پڑھیے سلام پڑھیے

:فروغِ نعت کے حوالے سے ان کا درج ذیل خوبصورت شعر بالکل حسبِ حال ہے

یہ عرشؔ میری کمائی ہے زندگی بھر کی

فروغِ نعت میں جو کچھ بھی میرا حصہ ہے

یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر اور توجہ طلب ہے کہ عرشؔ کی شاعری ابتدا سے ہی صنفِ نعت سے مشرف اور پیوستہ ہے جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ حبیب خدا ﷺ ہمیشہ سے مہربان ہیں اور جس پر حبیب خدا ﷺ مہربان، اس کی منزل آسان۔ سادگی، عاجزی، انکاری اور ملنساری ان کی نمایاں خصوصیات ہیں جو حقیقی بڑے انسان کی اصل پہچان ہے ورنہ تو نام نہاد بڑا آدمی کھجور کے درخت کی طرح محض بلند قامت ہوتا ہے جس کے بارے بھگت کبیرؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور

پَنتھی کو چھایہ نہیں، پھل لاگے اَتی دور

ترجمہ: کھجور کے درخت کی طرح بڑے ہونے کا کیا فائدہ کہ جس کے تلے مسافر کو سایہ بھی (میسر نہیں اور جس کے پھل اتنے دُور ہیں کہ ان تک رسائی حاصل نہیں۔

عرشؔ ہاشمی نعت کے فروغ کی فعال تنظیم "محفلِ نعت، پاکستان اسلام آباد" کے بانی اور روحِ رواں ہیں جو 1989 میں معرضِ وجود میں آئی تھی اور وقت گزرنے کے بعد ایک ننھے سے پودے سے بڑھ کر ماشاء اللہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

عرشؔ ہاشمی مدتِ دراز سے نعتوں پر نعتیں کہے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا اولین مجموعہ نعت "دُرود اُن پر، سلام اُن پر جو تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو حال ہی میں شایع ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے، خزینہ نعت میں گراں قدر اضافہ ہے جس کے لیے میں انھیں صمیمِ قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ عرشؔ کی نعتیہ شاعری کے حوالے سب سے چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ غزل گوئی سے ازلی اور قطعی اجتناب کے باوجود ان کی نعتوں میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار :ملاحظہ فرمائیں

میں مدینے جو پہنچ جاؤں گا، ہو گا محسوس

اپنے گھر جیسے سرِ شام پرندہ پہنچے

دیوانِ غالب کی پہلی غزل کی زمین میں عرشؔ ہاشمی کی نعت کا یہ شعر خاص توجہ کا :طالب ہے

ہم بُھلا بیٹھے نبی ﷺ کی سادہ زندگی

ہر بشر عادی ہوا اسراف کا تبذیر کا

عرش کی نعتیہ شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے عبد و معبود کے درمیان موجود فرق کو اپنے ہر شعر میں ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ کیا مجال کہ کہیں احتیاط کا دامن بُھولے سے بھی کبھی ان کے ہاتھ سے چُھوٹا ہو۔ وہ عُرفی کی اس نصیحت پر سختی سے عمل پیرا ہیں کہ:

"باخدا دیوانہ باش و، با محمد ﷺ ہوشیار"۔ وہ کہتے ہیں:

نبی ﷺ کا حکم فرمانِ خدا ہے

رضائے حق رضائے مصطفی ﷺ ہے

نبی ﷺ کی شان اور رتبے کا بیان وہ استدلال کے ساتھ اپنے خوبصورت انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

حق کو منظور نہ تھا ان کے برابر ہو کوئی

انتہا ہے کہ نہ سایہ نظر آیا اُن، ﷺ کا

عرش ہاشمی کے اس حسین اور خوشبوئے مصطفی ﷺ سے معطر گلدستہ نعت میں تین حمدیں، بانوے نعتیں، چار سلام بحضور امامِ عالی مقام اور پانچ منقبتیں شامل ہیں۔ اس انمول مُجلّد اور دیدہ زیب مجموعہ نعت "دُرود اُن پر، سلام اُن پر" کی قیمت ہے صرف 600 روپے۔ اس کے تقسیم کار ہیں: محفلِ نعت پاکستان، اسلام آباد۔

قومی کرکٹ کے معیار، عبدالحفیظ کاردار

گزشتہ 17 جنوری کا انتہائی اہم اور یادگار دن خاموشی سے گزر گیا۔اس دن پاکستانی کرکٹ کے معمار عبدالحفیظ کاردار کا 94واں یوم پیدائش تھا۔البتہ گوگل (Google) نے اس عظیم کرکٹر کے اعزاز میں اس موقعے پر ایک ڈوڈل (Doodle) ریلیز کر کے شایان شان خراج تحسین پیش کیا۔ عبدالحفیظ کاردار لاہور کے ایک آرائیں گھرانے میں 1925 میں پیدا ہوئے تھے۔انھیں بابائے پاکستان کرکٹ کہا جاتا ہے جو حرف بہ حرف بالکل بجا ہے۔ان کا شمار ان تین نامور کھلاڑیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے غیر منقسم ہندوستان اور اس کے بعد پاکستان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ان مایہ ناز کھلاڑیوں میں امیر الٰہی اور گل محمد کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ان تینوں کھلاڑیوں نے تقسیم سے پہلے ہندوستان میں ٹیسٹ کرکٹ کھیلی ہوئی تھی۔

عبدالحفیظ کاردار کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ وہ پاکستان کرکٹ ٹیم کے اولین کپتان اور معمار قرار پائے۔پاکستان کرکٹ کے ساتھ کاردار صاحب کا دلی لگاؤ تھا۔انھوں نے نا صرف پاکستانی کرکٹ کی بنیاد رکھی بلکہ انتہائی قلیل مدت میں اسے پروان بھی چڑھایا اور بین الاقوامی سطح پر متعارف کرایا۔انھوں نے 53-1952 میں بھارت کے دورے میں قومی ٹیم کی قیادت کی۔دوسری جانب ان کے مدمقابل بھارت کے مشہور و معروف کرکٹ کھلاڑی لالہ امرناتھ کے زیر قیادت کھیلنے والی ٹیم تھی۔اگرچہ دہلی اور بمبئی کے ٹیسٹ میچوں میں بھارتی ٹیم کو فتح حاصل ہوئی لیکن لکھنو ٹیسٹ میں شاندار کامیابی حاصل کر کے کاردار کی ٹیم نے لوگوں کے دل جیت لیے۔ لکھنو میں کھیلا جانے والا یہ دوسرا ٹیسٹ تھا۔ عبدالحفیظ کاردار کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے غیر منقسم ہندوستان میں انگلینڈ کے دورے پر ہندوستانی ٹیم کی قیادت کی۔اس کے علاوہ انھیں آکسفورڈ بلیو اور وارِک شائر کا نمایاں کھلاڑی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ کاردار نے وارِک شائر میں دو سیزن گزارے۔انھوں نے کلب کے چیئرمین Cyril Hastilow کی صاحبزادی سے پہلی شادی کی۔انھوں نے 1951 میں MCC کی ٹیم کے خلاف پاکستان کی قیادت کی۔یہ انھی کی کاوشوں کا ثمر تھا کہ پاکستان کو جولائی 1952 میں مکمل ٹیسٹ Status حاصل ہوا۔انگلینڈ کی ٹیم کے خلاف ان کی زیر قیادت کھیلنے والی پاکستانی ٹیم کو سب سے پہلی زبردست کامیابی 1954 میں Oval میں کھیلے گئے ٹیسٹ میچ میں حاصل ہوئی۔سچ پوچھیے تو اس میچ نے پاکستان کی نوخیز کرکٹ ٹیم کو عالمی نقشے پر متعارف کرایا۔اس میچ میں پاکستان کی ٹیم نے اپنی پہلی اننگز میں 133 رن اسکور کیے جبکہ کاردار 36 رن بنا کر سرفہرست رہے۔اسی میچ میں فضل محمود نے اپنی گیند بازی کے خوب جوہر دکھائے اور 99 رن دے کر 12 کھلاڑی آؤٹ کیے۔بلا شبہ یہ ایک تاریخی موقع تھا جب کسی ملک نے انگلینڈ کو اپنے پہلے دورے میں اس کی سرزمین پر شکست دی تھی۔

عبدالحفیظ کاردار نے 23 ٹیسٹ میچوں میں پاکستان کی مسلسل قیادت کی جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ انھوں نے بہت کم عرصے میں پاکستانی قوم کا نام کرکٹ کی دنیا میں روشن کیا۔ قائداعظم سے انھیں بڑی گہری عقیدت تھی اور اسی لیے ان کی تاعمر یہ کوشش رہی کہ پاکستان کا نام دنیا بھر میں عزت واحترام سے لیا جائے۔ پاکستانی کرکٹ کی تعمیر کے پس پشت ان کا یہی جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا۔ انھوں نے اپنی صلاحیت کے جوہر کا سب سے پہلا مظاہرہ 1946 میں انگلینڈ میں کیا۔ وہ آکسفورڈ گئے جہاں انھوں نے بلیو کا اعزاز حاصل کیا۔ کاردار کا آخری دورہ ویسٹ انڈیز کا تھا جہاں وہ اپنی ٹیم لے کر 1957 میں گئے۔ اس دورے میں انھیں انگلی پر شدید چوٹ آئی لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پاکستان کی عزت وو قار کو مد نظر رکھ کر انھوں نے 37 اوورز (overs) کیے اور 57 رنز بنائے۔ عبدالحفیظ کاردار کو اللہ تعالٰی نے مردانہ حسن سے نوازا تھا۔ وہ ایک دراز قد، خوش شکل اور پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں بلا کی قائدانہ صلاحیت موجود تھی۔ قائداعظم کی طرح وہ نظم وضبط کو اولیت دیتے تھے چنانچہ اس وقت کی پاکستانی کرکٹ ٹیم میں مثالی نظم وضبط قائم تھا۔ کاردار بہترین قائد ہونے کے علاوہ بذات خود بھی بڑے زبردست آل راؤنڈر تھے۔ وہ بائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرنے والے نہایت کامیاب بلے باز تھے۔ انھیں بائیں ہاتھ سے اسپن اور سلو میڈیم باؤلنگ کرنے پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ٹیم کے مشکل مرحلوں میں وہ اپنی ٹیم کے لیے ہمیشہ ڈھال بن جاتے تھے۔ بدقسمتی سے وہ 77-1976 میں کھلاڑیوں کے معاوضے سے متعلق ایک تنازع کا شکار ہوئے جس کے نتیجے میں انھیں عہدہ صدارت سے محروم

1958 میں کاردار، انٹرنیشنل ٹیسٹ کرکٹ سے ریٹائر ہوگئے جبکہ 21 اپریل 1996 کو وہ اس فانی دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر ملک عدم روانہ ہوگئے۔ غیر جانبدار کرکٹ امپائر کا تصور پیش کرنے والوں میں بھی کاردار کا شمار صف اول کے لوگوں میں ہوگا۔ وہ کرکٹ کے انتظامی معاملات میں سیاسی مداخلت کے بھی سخت ترین مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے نتیجے میں قومی کرکٹ کو تباہی کے سوائے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ وقت اور حالات نے ان کی اس پیش گوئی کو درست ثابت کر دیا ہے۔ پاکستانی کرکٹ کی موجودہ زبوں حالی اس حقیقت کی غمازی کر رہی ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں 1958 میں حکومت پاکستان کی جانب سے انھیں تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا جس کے وہ بجا طور پر صد فیصد مستحق تھے۔ انھوں نے 71 سال کی عمر میں وفات پائی۔ عبدالحفیظ کاردار جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ بقول اقبال:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آہ! صدیق بلوچ

آسمانِ صحافت کا ایک درخشاں ستارہ غروب ہوگیا۔ محمد صدیق بلوچ منگل 6 فروری کی صبح ملکِ عدم سدھار گئے۔

(اناللہ وانا الیہ راجعون!)

جن کے دم سے تھی بزم کی رونق

ہائے وہ لوگ اٹھتے جاتے ہیں

مرنجان مرنج، ملنسار، یاروں کے یار محمد صدیق بلوچ 1940 کراچی کے مشہور علاقے لیاری میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایس ایم آرٹس اینڈ کامرس کالج کراچی سے گریجویشن کیا اور اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے میدان صحافت کا انتخاب کیا اور 1968 میں انگریزی زبان کے انتہائی موقر روزنامے سے اپنے سفر صحافت کا آغاز کیا۔ وہ عرصۂ دراز تک اسی روزنامے سے بحیثیت اسٹاف رپورٹر، کرائم رپورٹر وابستہ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس اخبار سے استعفیٰ دے دیا اور اس وقت کے گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو کے ساتھ بحیثیت پریس سیکریٹری وابستہ ہوگئے۔ آٹھ ماہ بعد جب بلوچستان کی نیشنل عوامی پارٹی (NAP) کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا تو انھیں بھی پارٹی لیڈروں کے ساتھ ساتھ جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ 1977 میں جب انھیں نیپ (NAP) کے لیڈروں کے ساتھ رہائی ملی تو انھوں نے اپنے سابقہ انگریزی اخبار میں سینئر رپورٹر کی حیثیت سے دوبارہ شمولیت اختیار کرلی۔ وہ اس حیثیت سے 1989 تک صحافتی خدمات انجام دیتے رہے جس کے بعد انھوں نے "سندھ ایکسپریس" کے نام سے اپنا ذاتی اخبار نکالنا شروع کر دیا، لیکن بدقسمتی سے یہ سلسلہ کاروباری مشکلات کی وجہ سے جاری نہ رہ سکا اور دو سال بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ اس کے بعد صدیق بلوچ کراچی سے کوئٹہ منتقل ہوگئے جہاں انھوں نے 1992 میں اپنا انگریزی اخبار "بلوچستان ایکسپریس" نکالنا شروع کیا اور اس کے بعد 2000 میں اردو اخبار "آزادی" کی اشاعت بھی شروع کر دی۔

صدیق بلوچ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انھیں بلوچی اور سندھی کے علاوہ اردو اور انگریزی زبانوں پر بھی یکساں عبور حاصل تھا۔ وہ ان چاروں زبانوں میں یکساں روانی کے ساتھ لکھ اور بول سکتے تھے۔ بلوچستان کے حالات سے انھیں غیر معمولی آگاہی حاصل تھی اور عوام کے علاوہ صوبے کے مقتدر حلقوں میں بھی انھیں نہایت احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بلوچستان کی معاشی حالت اور قدرتی وسائل کے بارے میں ان کی تحریر کردہ کتابیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ ایک تیسری کتاب بھی تحریر کر رہے تھے مگر افسوس کہ زندگی نے انھیں اس کی تکمیل کی مہلت نہ دی۔ صدیق بلوچ ایک نڈر اور بے باک صحافی تھے اور وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے فن میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک فلاحی معاشرے کا قیام ان کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا جس کے لیے وہ تادمِ آخر جدوجہد کرتے رہے۔

اپنی جوانی کے دور میں انھوں نے طالب علموں کے حقوق کے لیے علم بلند کیا اور ایس ایم کالج طلبہ یونین کے صدر منتخب کیے گئے۔ اپنے صحافتی کیریئر کے دوران وہ کراچی یونین آف جرنلسٹس کے صدر، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی مجلس عاملہ کے ممبر اور کراچی پریس کلب کے نائب صدر بھی منتخب ہوتے رہے۔ ان کا صحافتی سفر پانچ دہائیوں پر محیط ہے۔

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

بدھ 7 فروری کو جب صبح سویرے ان کی رحلت کی خبر پڑھی تو دل کو بڑا زبردست دھچکا لگا اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے سنہری لمحات ایک فلم کی طرح آنکھوں کے آگے سے گزر گئے۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہماری پہلی اور آخری ملاقات پی آئی ڈی کوئٹہ میں ہوئی تھی جب ہم ریڈیو پاکستان، کوئٹہ کے اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے، تب ہماری محفلیں پی آئی ڈی میں خوب جما کرتی تھی اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ پی آئی ڈی کے سربراہ شجاع زیدی جنھیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے ان محفلوں کے روح رواں ہوا کرتے تھے۔ بلوچ صاحب کا ریڈیو پاکستان، کوئٹہ آنے کا بھی بہت اتفاق ہوتا تھا جہاں ہمارے شریک محفل امداد نظامی اور شجاع زیدی ہوا کرتے تھے۔ کسی نے کیا خواب کہا ہے ThePastisAnotherCountry بقول شاعر:

گزرا ہوا زمانہ آتا نہیں دوبارہ

حافظ خدا تمہارا!

صدیق بلوچ اور ہمارے درمیان مرحوم شجاع زیدی کے علاوہ ایک اور شخصیت بھی ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ ہیں نادر شاہ عادل جنھیں ہم سب پیار سے شاہ جی کہتے ہیں۔ آج 7 فروری کو یہ کالم سپرد قلم کرنے سے پہلے شاہ جی اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ اظہار تعزیت کر رہے تھے اور بلوچ صاحب کی یادیں ایک دوسرے کے ساتھ تازہ کر رہے تھے۔ شاہ جی کا کہنا تھا کہ میں بلوچ صاحب کو صحافت میں اپنے استاد کا درجہ دیتا ہوں اور انھیں اپنا Mentor تسلیم کرتے ہوئے بڑا فخر محسوس کرتا ہوں۔ صدیق بلوچ کے حوالے سے شاہ جی نے ایک اور مرحوم شخصیت کا بھی تذکرہ فرمایا جنھیں بلوچ صاحب کی شاید سب سے زیادہ قرب حاصل رہا۔ یہ تھے غلام علی کاکا جن کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے کبھی کسی اسکول یا مکتب کا منہ نہ دیکھا تھا مگر میدان صحافت میں اپنا لوہا منوالیا۔ موصوف صدیق بلوچ کے شاگرد بھی تھے اور جگری دوست بھی۔

احمد رشدی کی یاد میں

پاکستان کے منفرد اور انتہائی مقبول گلوکار احمد رشدی ماہ اپریل میں اس جہان فانی میں تشریف لائے۔ان کا یوم پیدائش 24اپریل ہے۔انھوں نے 1934 میں حیدر آباد دکن کے ایک معزز گھرانے میں آنکھ کھولی۔کم عمری میں ہی وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں آباد ہوگئے۔اس وقت ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ موسیقی کی دنیا میں کبھی وہ ماہتاب و آفتاب بن کر اتنا چمکیں گے کہ ان کا نام بچے بچے کی زبان پر ہوگا۔کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان کی قسمت ایک پتے کی طرح ہوتی ہے جو ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ پلٹ جاتا ہے۔

احمد رشدی جنھیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے ایک پیدائشی گلوکار تھے۔گانے کی تربیت انھوں نے کسی سے باقاعدہ حاصل نہیں کی تھی بلکہ یہ صلاحیت ایک عطیہ خداوندی تھی۔سونے پر سہاگہ یہ کہ قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہوگئی اور ریڈیو پاکستان کراچی نے انھیں اس خداداد صلاحیت کے جوہر دکھانے کا سنہری موقع فراہم کر دیا۔احمد رشدی کی رام کہانی خود ان کی زبانی ہم نے اس وقت سنی جب وہ،ریڈیو پاکستان سے بھارتی سامعین کے لیے نشر ہونے والے روزانہ ہندی پروگرام کے لیے اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے کے سلسلے میں ہمارے پاس تشریف لائے تھے۔ان دنوں ہم ہندی سروس کے پروگرام منیجر ہوا کرتے تھے۔ہندی سروس کے بھارتی سامعین کو ہم اس سے قبل پاکستان کے کئی اور نامور گلوکاروں اور گلوکاراؤں کے انٹرویوز سنوا چکے تھے اور ان کا بے حد اصرار تھا کہ ہم ان کی ملاقات احمد رشدی سے بھی کروائیں۔لیکن چونکہ احمد رشدی پاکستان کی فلم انڈسٹری سے مسلسل وابستگی کی وجہ سے فلم نگری لاہور میں مقیم تھے اس لیے وہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکے تھے، لیکن جب وہ لاہور کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لیے کراچی آگئے تو بڑی خوشی سے انٹرویو ریکارڈ کرانے کے لیے ہمارے پاس آگئے۔اس تفصیلی انٹرویو کے دوران انھوں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور اپنی زندگی کے بہت سے دلچسپ واقعات بھی مزے لے لے کر سنائے۔ان میں بعض باتیں اب ہمارے ذہن کی سلیٹ سے مٹ چکی ہیں۔کئی نشستوں کے بعد ریکارڈ کیا گیا،احمد رشدی کا یہ انٹرویو سامعین کو اس قدر پسند آیا کہ ہمیں اسے وقفے وقفے سے کئی بار نشر کرنا پڑا ۔بعض سامعین نے تو انھیں جوش محبت میں محمد رفیع ثانی کا خطاب بھی دے ڈالا۔احمد رشدی جتنے گائیکی کے دھنی تھے اتنے ہی باتوں کے بھی دھنی تھے۔ان کی باتوں میں بھی وہی مٹھاس اور چاشنی تھی جو ان کی گلوکاری میں تھی۔ان کے مزاج مین بلا کا انکسار تھا۔لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اتنے بڑے اور مانے ہوئے فنکار ہیں۔ان کی باتوں میں ایک خوشبو سی رچی بسی تھی جو بیان سے باہر ہے۔

جوہر قابل تو بہت سے لوگوں میں ہوتا ہے لیکن اسے دریافت کر کے بروئے کار لانا بھی جوہر شناس کا ہی کام ہوتا ہے۔احمد رشدی کی یہ خوش بختی تھی کہ انھیں ریڈیو پاکستان کراچی میں مہدی ظہیر جیسا جوہر شناس میسر آ گیا جن کے لکھے اور کمپوز کیے ہوئے گانے "بندر روڈ سے کیماڑی، چلی رے میری گاڑی، بابو ہو جانا فٹ پاتھ "...(1954) کے بچوں کے پروگرام میں نشر ہوتے ہی احمد رشدی کی شہرت اور مقبولیت کو گویا پر لگ گئے۔اس سے قبل وہ پاکستان کے قومی ترانے میں بھی اپنی آواز ملا چکے تھے۔

پاکستان کی فلم انڈسٹری میں قدم رکھتے ہی انھوں نے اپنی منفرد آواز اور انداز کا جادو جگادیا،واقعی:

آواز وہ جادو سا جگاتی ہوئی آواز

انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پلے بیک گلوکاری کا سکہ جمادیا اور سلیم رضا اور میر حسین جیسے سینئر گلوکاروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ "کوکو رینا" والے ان کے فلمی نغمے نے پورے ملک میں دھوم مچادی۔1961 سے 1976 تک احمد رشدی نے پاکستان کی فلم انڈسٹری پر راج کیا اور وہ اس پر چھائے رہے۔ریڈیو پاکستان کے ہر اسٹیشن سے بس انھی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ "اک اڑن کھٹولا آئے گا" والے ان کے مشہور گانے نے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔جو بھی اس گانے کو سنتا جھوم اٹھتا اور لہک لہک کر ناچنے لگتا۔ لیکن انھی احمد رشدی نے جب ایک افسردہ گانا "جب رات ڈھلے" گایا تو سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔سب حیران تھے کہ شوخ اور چنچل گانے گانے والا گلوکار احمد رشدی ایسا پر سوز نغمہ بھی گا سکتا ہے۔احمد رشدی کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک ورسٹائل گلوکار تھے۔

دو عشروں پر محیط مختصر عرصے میں احمد رشدی نے تقریباً 1000 نغمے گائے جن میں سے زیادہ تر گانے انھوں نے وحید مراد کے لیے گائے جن کی تعداد 140 کے لگ بھگ ہے۔ فلم "ہیرا اور پتھر" سے لے کر آخری پروڈکشن ہیرو تک ان کی وابستگی کا یہ سلسلہ 1985 تک جاری رہا۔رشدی کے 80 سے زائد گانے فلم اسٹار ندیم پر فلمائے گئے۔ فلم "دوبدن" اور "مسٹر بدھو" میں ندیم نے رشدی کے ساتھ مل کر بھی گانے گائے۔پرانے فلمی اداکاروں میں رشدی کے گائے ہوئے نغمے سنتوش کمار، لالہ سدھیر اور علاؤالدین پر بھی فلمائے گئے۔انھوں نے سنتوش، درپن اور منصور براداران پر فلمائے گئے گانے بھی خوب گائے۔انھوں نے اپنے زمانے کے ابھرتے ہوئے اداکاروں غلام محی الدین، راحت کاظمی اور عثمان پیرزادہ کے لیے بھی بڑی اچھی پلے بیک Singing کی۔

احمد رشدی کو گلوکاری میں تاثرات کے اظہار پر عبور حاصل تھا۔اس وصف میں ان کا موازنہ محمد رفیع سے کیا جاسکتا ہے۔ فلم "جب جب پھول کھلے" میں ان کا گایا ہوا گانا "بڑھاپے میں دل نہ لگانا" کبھی نہ بھلایا جاسکے گا۔یہ گانا وحید مراد اور ندیم پر فلمایا گیا جس میں وحید مراد نے نوجوان کا اور ندیم نے بوڑھے کا کردار ادا کیا تھا۔احمد رشدی کا کمال یہ تھا کہ اس گانے میں اس نے نوجوان اور بوڑھے کے تاثرات کا عکس اپنی آواز کے ذریعے بڑے کمال کے ساتھ پیش کیا تھا۔

اداکار وحید مراد پر فلمائے گئے گانوں کے حوالے سے احمد رشدی کو وہی مقام حاصل تھا جو گلوکار محمد رفیع کو فلم اسٹار شمی کپور کے پلے بیک سنگر کے طور پر حاصل تھا۔ پاکستان کے مشہور فلمی ہیرو شاہد حسین کا 70 کی دہائی میں پاکستان کی فلمی دنیا میں بڑا بول بالا تھا اپنی کامیابی کا کریڈٹ اپنے پلے بیک سنگر کی حیثیت سے احمد رشدی کو ہی دیتے ہیں۔ رشدی نے فلم ''دیکھا جائے گا'' (1976) میں دما دم مست قلندر کا انگلش Version گا کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوالیا جس کے بول تھے Thisisthesongofwonder۔ ان کا تلفظ اور لہجہ بالکل پرفیکٹ تھا۔

احمد رشدی نے میڈم نور جہاں، مہ ناز، ناہید اختر، ناہید نیازی اور نیرہ نور جیسی معروف اور مقبول گلوکاراؤں کے ساتھ مل کر بھی بڑے پیارے دوگانے گائے جو بے حد پسند کیے گئے، لیکن سب سے زیادہ ساتھ انھوں نے گلوکارہ مالا کا دیا۔ اس کے بعد گلوکارہ رونا لیلیٰ کا نمبر آتا ہے۔

70 کی دہائی میں پی ٹی وی کے عروج کے ساتھ احمد رشدی نے بھی ٹی وی کا رخ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹی اسکرین پر بھی چھاگئے۔ ٹی وی شو ''بزم رشدی'' بے حد مقبول ہوا جس سے بعد میں گلوکار عالم گیر اور دیگر گلوکاروں نے بھی خوب فائدہ اٹھایا۔ احمد رشدی جیسے عظیم فنکار روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

نابغہ روزگار اسلم اظہَر

ساقیایاں لگ رہاہے چل چلاؤ

لیجیے اختتام ماہِ دسمبر ممتاز براڈکاسٹر ،مایہ ناز میڈیا پرسن اور بابائے پی ٹی وی اسلم اظہر بھی اپنے بے شمار چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ان کے سانحہ ارتحال سے پاکستان کے الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ کبھی پُر نہ ہو گا۔83 سالہ اسلم اظہر نے ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کے گھرانے میں 1932 لاہور میں آنکھ کھولی۔وہ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے1950 کی دہائی میں کیمبرج یونیورسٹی چلے گئے اور وطن واپس آنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل آئل کمپنی میں ملازم ہوگئے ،لیکن کارپوریٹ شعبے میں ان کے قیام کا عرصہ بہت مختصر تھا کیونکہ یہ کلچر ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ چنانچہ 1960 کی دہائی میں انھوں نے شہر قائد کراچی کا رخ کیا اور دستاویزی فلموں ،ایڈورٹائزنگ اور ریڈیو براڈکاسٹنگ سے وابستہ ہوگئے۔وہ کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کی بنیاد ڈالنے والے اراکین کی صف میں شامل ہوگئے۔اسی تھیٹر گروپ میں ان کی ملاقات نسرین سے ہوگئی جو بعد میں ہمیشہ کے لیے ان کی جیون ساتھی بن گئیں اور تادم آخر ان کے ساتھ رہیں۔

قدرت نے اسلم اظہر کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔وہ بے مثل اداکار ہی نہیں بلکہ بڑے کمال کے انگلش نیوز ریڈر بھی تھے۔ ہم نے اپنے براڈکاسٹنگ کے کیریئر میں بہت سے لوگوں کو انگریزی بولتے ہوئے دیکھا ہے مگر اسلم اظہر والی بات ہمیں کسی اور میں نظر نہیں آئی۔اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آرہا ہے جس کے ہم عینی شاہد ہیں۔ ان دنوں ہم ریڈیو پاکستان کے صدر دفتر ،اسلام آباد میں تعینات تھے اور اسلم اظہر پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن اور پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن (ریڈیو پاکستان) کے چیئرمین کے منصب پر فائز تھے۔پی ٹی وی ہیڈکوارٹرز ، اسلام آباد میں ایک خصوصی میڈیا بریفنگ کا اہتمام کیا گیا، جس میں ہمیں بھی بلایا گیا تھا۔پاکستان میں برطانیہ کے ہائی کمشنر سرجان ہیرنگٹن اس موقعے پر خطاب کرنے والے مہمان خصوصی تھے۔خطاب کا موضوع تھا ''افغانستان کی صورتحال اور پاکستان''۔ابتدائی کلمات اسلم اظہر نے ادا کیے جس میں انھوں نے مہمان خصوصی کا تعارف کرانے کے علاوہ موضوع پر بھی روشنی ڈالی۔اس کے بعد مہمان خصوصی کی باری آئی تو انھیں یہ اعتراف کرناپڑا کہ میزبان نے انھیں بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے کیونکہ نہ تو وہ اتنی خوبصورت زبان بول سکتے ہیں اور نہ ہی انھیں موضوع پر اتنی گرفت حاصل ہے۔

حکومت وقت نے 1964 میں پاکستان میں ٹیلی ویژن کے آغاز کا فیصلہ کیا جس کے لیے لاہور میں ایک پائلٹ اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا۔یہ انتہائی اہم اور کٹھن ذمے داری اسلم اظہر کو سونپی گئی جنھوں نے صرف تین ماہ کی بے حد قلیل مدت میں اس کام کو پورا کر دکھایا۔لاہور اسٹیشن کی کامیابی کے ساتھ شروعات کے بعد حکومت وقت نے ڈھاکہ ،راولپنڈی اور کراچی میں پی ٹی وی کے اسٹیشن قائم کیے اور اس کے نتیجے میں اسلم اظہر ترقی پاکر پی ٹی وی کے منیجنگ ڈائریکٹر بن گئے۔ ڈرامے سے اسلم اظہر کو شروع ہی سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔وہ انتہائی باصلاحیت فن کار نہیں تھے بلکہ بلا کے جوہر شناس اور جوہر قابل کی تلاش و خراش کرنے میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔یہی وجہ تھی کہ بہت مختصر سے عرصے میں انھوں نے اہل قلم اور فنکاری کی ایک بہترین ٹیم پی ٹی وی میں تیار کر لی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پی ٹی وی کو ایک ایسا مثالی ادارہ بنا دیا کہ جس کے پروگرام نہ صرف وطن عزیز میں بلکہ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں بھی مقبولیت کے غیر معمولی ریکارڈ قائم کرتے چلے گئے۔

ان کا دور پی ٹی وی کا سنہری دور مانا جاتا ہے۔ ٹی وی کے عام ناظرین کی پسند کا خیال رکھنے کے علاوہ مخصوص ذوق کے حامل ٹی وی ناظرین کے لیے بھی ''کسوٹی'' جیسے بے مثال اور لازوال پروگرام متعارف کرانے کا سہرا بھی اسلم اظہر ہی کے سر رہے گا۔ ''ففٹی ففٹی'' جیسا مقبول ترین پروگرام پیش کر کے دکھانا بھی ان ہی کی سرپرستی اور رہنمائی کا مرہون منت ہے۔ پی ٹی وی کے زبردست ڈرامے اس کے علاوہ ہیں۔ عوام آج بھی ان سدابہار ڈراموں کے دیوانے ہیں۔

اسلم اظہر کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس دور میں ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا وطن عزیز میں کوئی وجود نہیں تھا اور پی ٹی وی کے پروگرام لائیو نشر کیے جاتے تھے۔ آج کے دور میں جب ہمیں ریکارڈنگ کی سہولت میسر ہے لائیو پروگرام پیش کرنے کی مشکلات کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ اسلم اظہر انتہائی وسیع المطالعہ شخص تھے اور انگریزی اور اردو پر انھیں یکساں عبور حاصل تھا۔ بڑے بڑے ادیب اور شاعر نہ صرف ان کے بہت قریب تھے بلکہ ذاتی طور پر ان کے چاہنے والے اور مداح بھی تھے۔ ترقی پسند سوچ اور روشن خیالی ان کے خمیر میں رچی بسی ہوئی تھی۔ جس کی قیمت انھیں جنرل ضیاالحق کے دور حکمرانی میں ادا کرنی پڑی۔ وہ ایک عظیم براڈ کاسٹر اداکار اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل منتظم ہی نہیں بلکہ بلند پایہ انسان بھی تھے۔ سادگی، انکساری اور وضع داری ان پر ختم تھی اس کا ذاتی تجربہ ہمیں ان سے پہلی ملاقات میں ہی ہوگیا تھا جب ہم ایک مشترکہ دوست کے اصرار پر ان سے ملنے کے لیے اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ پر گئے تھے۔ اس وقت وہ پی ٹی وی اور پی بی سی دونوں کے چیئرمین تھے اور منصب کے لحاظ سے ہم ان کے ایک ماتحت تھے، مگر ہمیں اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب ہم نے انھیں وقت مقررہ پر سراپا انتظار پایا۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)۔

آہ، جمیل الدّین عالی

جن کے دم سے تھی بزم کی رونق
ہائے وہ لوگ اٹھتے جاتے ہیں

لیجیے عالی جی بھی ہم سب کو سوگ وار اور غم زدہ چھوڑ کر ملک عدم روانہ ہو گئے۔ خاندانی نواب مگر مزاجاً درویش اور قلندر۔ نواب زادہ جمیل الدین احمد خان المعروف جمیل الدین عالی۔ انھیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ وہ ایک نہایت اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کے بارے میں بے اختیار کہا جاسکتا ہے کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"۔ سخنوری ان کی گھٹی میں شامل تھی جو انھیں اپنے پرکھوں سے ورثے میں ملی تھی۔ ان کے دادا نواب علاؤ الدین احمد خان کا شمار مرزا غالب کے نمایاں شاگردوں میں ہوتا تھا جبکہ ان کے والد بزرگوار نواب امیر الدین احمد خان فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ عالی جی نے اپنے اس ورثے کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔

عالی جی ایک پہلودار اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور ہر جہت میں انھوں نے اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ اگر چہ پیشے کے لحاظ سے بینکار تھے مگر ان کا اصل میدان شاعری ہی ہے جس سے انھیں دنیا کے گوشے گوشے میں وہ قابل رشک شہرت حاصل ہوئی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کے خاندان کی طرح ان کی شاعری کا بھی ایک شجرہ نسب ہے جس میں غزلیں، نظمیں، گیت اور لازوال قومی نغمے شامل ہیں جن میں "جیوے، جیوے پاکستان" اور "اے وطن کے سجیلے جوانو' میرے نغمے تمہارے لیے ہیں" جو آج بھی وطن عزیز کے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور جن کی گونج بیرونی ممالک میں بھی دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ یہ سدابہار نغمے نہ صرف 1965 کی پاک بھارت جنگ میں ہمارے بہادر فوجی جوانوں کے حوصلے بلند کرنے کا ذریعہ بنے بلکہ آج بھی اہل وطن کے خون کو گرما کر ہمیں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا درس دے رہے ہیں۔ فخر پاکستان حکیم محمد سعید شہید کی طرح جمیل الدین عالی کو بھی وطن عزیز سے اپنی جان عزیز سے بھی بڑھ کر پیار تھا۔ چناں چہ مملکت خداداد کے وجود پذیر ہوتے ہی انھوں نے رخت سفر باندھا اور اپنی جنم بھومی دلی کو چھوڑ کر پاکستان کا رخ کیا جہاں زندگی کے ابتدائی ایام میں شہر قائد کراچی میں اس نواب زادے نے بڑی بڑی کٹھنائیں جھیلیں اور بالآخر اپنا ایک منفرد مقام بنایا۔

جمیل الدین عالی واقعی اسم با مسمّیٰ تھے۔ جو بھی ایک بار ان سے مل جاتا تھا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ برسوں پرانی بات ہے جب ریڈیو پاکستان کراچی میں ہندی سروس کے زیر اہتمام ایک شعری نشست میں ہمیں ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کوئی مشاعرہ تھا جن میں مرحوم احمد ہمیش اور رئیس فروغ کے علاوہ برادرم اسد محمد خان صاحب نے بھی ہندوستان کے سامعین کے دل اپنے کلام سے موہ لیے تھے۔ صدر مشاعرہ عالی جی نے اپنے منفرد انداز میں دوہے سنا کر سب کو سرشار کر دیا۔

دوہا نگاری عالی کی شاعری کا بنیادی وصف ہے جس کی بدولت انھیں سب سے زیادہ اور نمایاں مقبولیت حاصل ہوئی مگر تکنیکی اعتبار سے ان کے دوہے ہندی شاعری کے معروف دوہا نگاروں بشمول عبدالرحیم خان خاناں، تلسی داس ، بہاری، امیر خسرو اور کبیر داس سے مختلف ہیں۔ عروضی اعتبار سے بھی یہ دوہے کلاسیکی ہندی شاعروں کے دوہوں سے اپنا ایک الگ انگ، رنگ اور آہنگ رکھتے ہیں۔ نیز ان کے اوزان بھی کافی مختلف ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اُڑ جائے
ٹھنڈی چاندنی اُجلا بستر بھیگی بھیگی رین
سب کچھ ہے پر وہ نہیں یارو جس کو ترس گئے نین

امر واقعہ یہ ہے کہ عالی نے دوہوں کے ذریعے اپنی روح کی پیاس بجھانے کا اہتمام کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دوہے گیت سنا کر عالی من کی پیاس بجھائے
من کی پیاس بجھی نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

عالی نے اپنی غزل کی طرح دیگر اصناف شاعری کو بھی فارسی لفظیات کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے ہندی کے تال میل سے سجانے کی خوبصورت اور کامیاب کوشش کی ہے جس نے ان کی شاعری کو چار چاند لگا دیے ہیں اور مقبولیت کے بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔

نثر میں بھی عالی نے اپنا ایک منفرد اسلوب اختیار کیا جس کا عکس بالکل واضح طور پر ان کی ہر تحریر میں دکھائی دیتا ہے ۔ان کی کالم نگاری کا عرصہ بھی نصف صدی سے زیادہ پر محیط ہے۔ان کے اخباری کالم عام کالم نگاروں سے بہت مختلف ہیں جن پر ان کی شاعری اور دانش وری کی چھاپ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ کالموں کے علاوہ ان کے سفر نامے بعنوان ''دنیا مرے آگے تماشا مرے آگے'' بھی بہت مقبول ہوئے۔ان کے سفر ناموں میں ایران، عراق ، مصر، لبنان، برطانیہ، روس، جرمنی، ہالینڈ، سوئٹزر لینڈ، اٹلی اور امریکا سمیت کئی اہم ممالک شامل ہیں۔ ان سفر ناموں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کے ذریعے انھوں نے اپنے قاری کو آگاہ اور Educate کرنے کی کوشش کی ہے اور ماضی کا تعلق عہد حاضر سے جوڑنے کا اہتمام کیا ہے۔اس کے علاوہ عالی جی کی نثر نگاری میں ان کی مختصر تحریریں بھی شامل ہیں جو انھوں نے انجمن ترقی اردو کی مطبوعات پر ''حرف چند'' کے عنوان سے سپرد قلم کی ہیں۔

اردو کی ترویج و فروغ کے حوالے سے عالی جی کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ پورے 54 برس تک انجمن ترقی اردو پاکستان کے اعزازی معتمد کے طور پر بے لوث خدمات انجام دیتے رہے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خواب کو اردو یونیورسٹی کی صورت میں شرمندہ تعبیر کرنے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ اس حوالے سے اگر انھیں ''مجاہد اردو'' کا خطاب دیا جائے تو یہ ان کے شایان شان ہوگا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل بھی ان ہی کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ عالی جی انجمن ساز ہی نہیں اپنی ذات میں بھی ایک انجمن تھے۔

ایسے آئینہ صفت لوگ کہاں سے لائیں
سلسلے ختم ہوئے انجمن آرائی کے

جانے والوں کی یاد آتی ہے

جولائی کا مہینہ ادبی شخصیات کے سانحات ورحلت کے حوالے سے بڑا بھاری ہے کہ عبداللہ حسین اور خاطر غزنوی نے اسی ماہ میں داغ مفارقت دیا۔ بلاشبہ دونوں ہی قصرادب کے بہت بڑے ستون تھے۔ دیگر خصوصیات کے علاوہ دونوں ہی میں یہ قدر مشترک رہی کہ ان کی شہرت کی خوشبوان کے اصلی ناموں سے نہیں بلکہ قلمی ناموں سے دنیائے ادب میں پھیلی۔ عبداللہ حسین کا اصل نام محمد خان تھا مگر لوگ انھیں زیادہ تر عبداللہ حسین کے قلمی نام سے ہی جانتے اور پہچانتے ہیں۔ انھوں نے جولائی کے پہلے ہفتے میں زندہ دلوں کے شہر لاہور میں 84 برس کی عمر میں وفات پائی۔ وہ کافی عرصے سے خون کے سرطان کے عارضے میں مبتلا تھے۔ وہ 14 اگست 1931 کو گجرات کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی اسکول تعلیم بھی گجرات ہی میں حاصل کی اور گریجویشن بھی وہیں کے زمیندار کالج سے مکمل کی۔ عبداللہ حسین بڑے خوش نصیب تھے کہ ان کا پہلا ہی ناول ''اداس نسلیں'' ہٹ ہوگیا اور ان کی شہرت کی خوشبو پر لگاکر چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ اس ناول کو شایع کرنے کا اعزاز نذیر احمد کے اشاعتی ادارے نیا ادارے کو حاصل ہوا۔ نذیر احمد نے ''اداس نسلیں'' کا مسودہ حاصل ہوتے ہی اپنے دوست شیخ صلاح الدین کے حوالے کردیا کہ وہ اسے پڑھ کر اس کے بارے میں رائے دیں کہ آیا یہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ شیخ صلاح الدین نے صرف ایک ہفتے کے مختصر عرصے کے بعد یہ رائے دی کہ یہ ناول فوراً شایع کرایا جائے کیونکہ ان کے خیال میں مایہ ناز انگریزی ناول نگار ڈی ایچ لارنس کی وفات کے بعد ایسا ناول کسی نے یورپ میں بھی نہیں لکھا تھا۔ چنانچہ نیا ادارہ نے بلاتاخیر اور نہایت اہتمام کے ساتھ اس ناول کو شایع کیا۔ عبداللہ حسین کی فرمائش پر اس کا ٹائٹل پاکستان کے انتہائی نام ور مصور عبدالرحمٰن چغتائی سے ڈیزائن کرایا گیا۔ اس ناول کی اشاعت نے نوجوان ناول نگار کو دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کے بام عروج تک پہنچادیا اور ان کی ساکھ اور دھاک ایسی جمی کہ ان کی دوسری تحریروں ''نشیب'' اور ''باگھ'' کی اشاعت کا سہرا بھی ''نیا ادارہ'' ہی کے سر پر سجا اور ان دونوں کی شہرت اور مقبولیت کو بھی گویا پر لگ گئے۔ عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' کا انگریزی ترجمہ "TheWearyGeneration" کے عنوان سے بذات خود ہی کیا۔ ان کی شہرت کا خوب خوب فائدہ ان کی دیگر تحریروں کو بھی پہنچا جن میں ''نادار لوگ'' ''قید'' اور ''رات'' کے علاوہ ان کے افسانے بھی شامل ہیں۔ زمیندار کالج گجرات سے گریجویشن کرنے کے بعد عبداللہ حسین نے ایک سیمنٹ فیکٹری میں بطور کیمسٹ ملازمت بھی کی لیکن قسمت کی دیوی ان پر بہت جلد مہربان ہوگئی جس کے بعد بحیثیت ایک لکھاری وہ فکرِ معاش سے آزاد ہوگئے اور لکھنے لکھانے کو ہی انھوں نے اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔ اس سے قبل کے درمیانی عرصے میں کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کرنے کے لیے وہ کینیڈا بھی گئے جہاں انھوں نے ایک ڈاکٹرنی سے شادی کرلی جن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔ انھوں نے 40 سال کے طویل عرصے تک برطانیہ میں قیام کیا جس کے بعد وہ کچھ عرصہ پہلے پاکستان آکر مقیم ہوگئے۔ عبداللہ حسین نے یورپ کے مختلف ممالک کے بہت سفر کیے۔ اگرچہ وہ مزاجاً Introvert نہیں تھے لیکن محفلوں میں آنے جانے کا انھیں کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ سن 60 کی دہائی میں جب ''اداس نسلیں'' منظر عام پر آیا تو اس وقت ہر طرف قرۃ العین کے شاہکار ناول ''آگ کا دریا'' کی شہرت کے

چرچے تھے اور اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی اور ناول نگار کی بھی دال گل سکتی ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اداس نسلیں، آگ کا دریا سے متاثر ہے مگر ہمارے خیال میں اس بحث میں الجھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کچھ لوگوں کو اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ ''اداس نسلیں'' میں جگہ جگہ سفلی گالیوں کا تڑکا لگا ہوا تھا جبکہ قارئین کا ایک حلقہ اسے ان کی حقیقت نگاری سے تعبیر کر کے اس کی تحسین کرنے میں مصروف تھا۔ مگر ادبی تحریر میں گالیوں کا استعمال محض عبداللہ حسین ہی کا کارنامہ نہیں ہے کیونکہ یہ تجربہ برصغیر کے مشہور انگریزی ناول نگار اور ترقی پسند تحریک کے ایک انتہائی سرگرم کارکن ڈاکٹر مل کھراج آنند کے یہاں بھی جابہ جا نظر آتا ہے۔ بہر حال اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ عبداللہ حسین کی تحریروں میں حقیقت نگاری کا عنصر بہت نمایاں ہے جس میں زندگی کا عکس واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک ادیب کی حیثیت سے انھیں سیاست کی بھی بڑی سمجھ تھی۔ جزیات نگاری بھی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ ہر منظر کو اپنے ذہن میں جذب کرتے اور لکھتے وقت اسے کینوس پر اتارنے میں بھی بڑا کمال رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ پاکستان اور افغانستان میں امریکی سی آئی اے کے عمل دخل پر بھی کچھ لکھیں لیکن وقت نے انھیں اس کام کو انجام دینے کی مہلت ہی نہیں دی اور وہ اپنی اس خواہش کو اپنے دل میں لیے ہوئے ملک عدم سدھار گئے۔ جولائی کے مہینے میں ہی اس جہان فانی سے کوچ کرنے والے دوسرے بڑے لکھاری خاطر غزنوی تھے جن کا اصل نام محمد ابراہیم بیگ تھا۔ وہ 1925 میں پشاور کے ایک اعلیٰ گھرانے میں پیدا ہوئے اور انھوں نے 1958 میں پشاور یونیورسٹی سے نمایاں پوزیشن کے ساتھ اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کیا جہاں انھیں اردو لیکچرر کی اسامی پر کام کرنے کی پیشکش بھی ہوئی لیکن انھوں نے اپنے پرانے ادارے ریڈیو پاکستان سے اپنی وابستگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شعر و شاعری کے علاوہ لسانیات سے بھی خاطر غزنوی کو بڑا گہرا شغف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اردو زبان ہندکو زبان کی ہی پیداوار ہے۔ یہ نظریہ انھوں نے اپنی کتاب ''اردو زبان کا ماخذ ہندکو'' میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ ان کا انتقال 7 جولائی 2008 کو کراچی کے ایک اسپتال میں ہوا۔

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

احسان دانش کی یاد میں

دن اور تاریخ تو ہمیں یاد نہیں البتہ یہ بات ہمارے حافظے میں کل کی سی بات کی طرح آج بھی محفوظ ہے جب ہماری احسان دانش صاحب سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی تھی۔ دانش صاحب ہمارے بزرگ ہی نہیں بلکہ پسندیدہ شاعر بھی تھے اور ان سے ہمارا غائبانہ تعارف مدت دراز قبل زمانہ طالب علمی میں ہی ہو چکا تھا۔ ان سے بالمشافہ ملاقات کا شرف ہمیں ریڈیو پاکستان کراچی میں اس وقت حاصل ہوا جب ہم اس عظیم ادارے سے بحیثیت پروگرام منیجر وابستہ تھے۔ وہ اپنی کسی نجی مصروفیت کے سلسلے میں لاہور سے کراچی تشریف لائے ہوئے تھے اور ہماری خصوصی درخواست پر ریڈیو پاکستان کے لیے انٹرویو ریکارڈ کرانے پر بخوشی آمادہ ہو گئے تھے۔

جہاں تک ہمیں یاد ہے وہ ماہ مارچ کی ایک خوش گوار صبح تھی اور ہم ایم اے جناح روڈ پر واقع ریڈیو پاکستان کی پرانی عمارت کی ایک بیرک کے اپنے کمرے میں ان کی آمد کے منتظر تھے۔ ریڈیو والے وقت کی پابندی کے عادی ہوتے ہیں، اس لیے ہم بھی دانش صاحب کے انتظار میں بار بار گھڑی پر نظر ڈال رہے تھے۔ دانش صاحب نے مقررہ وقت پر تشریف لاکر حکیم محمد سعید شہید اور حکیم محمد احسن صاحب (مرحوم) کی یاد تازہ کر دی جن کی پابندی وقت کے ہم ہمیشہ معترف رہیں گے۔ دانش صاحب کی آمد کے ساتھ ہی پورے کمرے میں گویا ایک خوشبو اور روشنی سی پھیل گئی اور ہمیں فراق صاحب کا وہ شعر یاد آ گیا جو انھوں نے اپنی ذات کے حوالے سے برجستہ کہا تھا:

آنے والی نسلیں تم پر ناز کریں گی ہمعصرو
جب تم ان کو بتلاؤ گے ہم نے فراقؔ کو دیکھا تھا

ہم واقعی بڑے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں فراق صاحب اور دانش صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ یہ ملاقاتیں ہمارے لیے سرمایہ حیات کا درجہ رکھتی ہیں۔

احسان دانش صاحب اور ہمارے درمیان دو باتیں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک مظفر نگر جو ہندوستان کے سب سے بڑے اور مشہور صوبے اتر پردیش (یوپی) کا ایک انتہائی اہم اور معروف ضلع ہے اور دوسرے شعر و شاعری۔ دانش صاحب اسی ضلع کے ایک قصبے کاندھلہ میں 1914 میں پیدا ہوئے جو جید علمائے دین کے حوالے سے بھی اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے۔ انھوں نے ایک محنت کش گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد قاضی دانش علی قصبہ باغپت ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے اور ان کے نانا ابو علی کاندھلہ میں ایک غریب سپاہی کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ احسان دانش صاحب کے والد صاحب بھی کوئی پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے مگر ان کا علمی ذوق بڑا وسیع تھا اور انھیں فارسی کی سیکڑوں غزلیں زبانی یاد تھیں جس کا تذکرہ احسان دانش صاحب نے اپنی سرگزشت میں بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ تاہم اپنے چشم و چراغ کو زیور علم سے آراستہ کرنے کی شدید خواہش اور تمنا اپنے دل میں رکھتے تھے۔ افسوس کہ غربت نے ان کی اس دلی آرزو کی تکمیل میں رکاوٹ حائل کر دی اور اس کے نتیجے میں احسان دانش کو کم عمری ہی میں پیٹ پالنے کے لیے محنت مزدوری کا سہارا لینا پڑا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے قصبے میں ہی روزگار تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر گردش حالات نے انھیں میونسپلٹی میں نائب قاصد کے طور پر نوکری کرنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے وہ اپنے استاد قاضی محمد ذکی کاندھلوی سے فیض حاصل کرتے رہے۔ اس حوالے سے وہ اپنی سرگزشت میں یوں رقم طراز ہیں۔ ''میرا مطالعہ اور جذبہ مجھے قصبہ کاندھلہ میں بلند نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ میں کھیتوں کھلیانوں، سڑکوں اور دفتروں کے راستے ناپتا ناپتا تھک گیا۔'' تھک ہار کر انھوں نے تلاش معاش کے سلسلے میں دہلی کا رخ کیا اور ایک چھاپہ خانہ میں کچھ عرصہ Inkman کی حیثیت سے کام کیا لیکن عدم اطمینان کے باعث کاندھلہ واپس آ گئے۔ اس کے بعد گردش حالات نے انھیں لاہور کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا جہاں کچھ عرصے تک انھوں نے باورچی کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

لاہور کے ابتدائی ایام ان کے لیے بڑی کڑی آزمائش تھے۔ دن بھر کی محنت و مشقت انھیں اس قدر نڈھال کر دیتی تھی کہ وہ بے حس و حرکت پڑے رہتے۔ لیکن بوڑھے والدین کا احساس انھیں پھر سے توانا کر دیتا تھا اور وہ اپنی ہر نئی صبح کا آغاز ایک نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ کر دیتے۔ مطالعے کا ذوق ان کی گھٹی میں شامل تھا۔ چنانچہ دوپہر کو آرام کے مختصر وقت میں وہ لائبریری کا رخ کرتے اور رات گئے تک کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے ذوق کی تسکین کرتے تھے۔ محنت مزدوری کے مرحلے سے گزر کر وہ معمار بن گئے اور پھر انھیں چوکیداری کی نوکری میسر آگئی جہاں انھیں کتابیں پڑھنے کے لیے زیادہ وقت میسر آگیا۔ چوکیداری کے بعد انھوں نے باغبانی اور پھر قالین بافی کا پیشہ اختیار کیا تاکہ ''روزی تو کسی طور کما کھائے مچھندر۔''

اسی دوران ان کی شاعری بھی پروان چڑھتی رہی۔ چنانچہ رات کو وہ مشاعروں کی محفلوں میں جلوہ افروز ہوتے تو دن کے وقت ہاتھوں میں برش اور رنگ و روغن کی بالٹی تھامے ہوئے محنت مزدوری کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔

لاہور شہر میں احسان دانش صاحب نے اپنے ابتدائی ایام میں بڑے پاپڑ بیلے اور سخت محنت اور عسرت کی زندگی بسر کی جس میں مزدوری، معماری، باغبانی، چوکیداری اور قلعی گری بھی شامل ہے لیکن ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے محنت کو عار نہ سمجھا اور محنت میں عظمت کو اپنا شعار بنایا اور وہ کبھی ہمت نہیں ہارے۔ کتابیں احسان دانش کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ یہ ان کا ذوق مطالعہ ہی تھا جس نے چار جماعتیں پڑھے ہوئے ایک معمولی سے طالب علم کو بہت بڑا عالم بنا دیا۔ ریلوے میں کچھ عرصہ نائب قاصد کے طور پر خدمات انجام دینے کے بعد کتابوں سے عشق نے انھیں ایک مطبع کے کتب خانے میں بیس روپے ماہانہ کی ملازمت اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اسی عرصے میں ان کی پہلی کتاب ''حدیث ادب'' اشاعت پذیر ہوئی جس کے بعد انھوں نے اپنے ایک مکتبہ کی بنیاد رکھی اور اس کے بعد کتابیں لکھنے اور شایع کرنے کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ کتاب ان کی زندگی بھر کی ساتھی رہی اور یہی ان کی وجہ شہرت بھی بنی۔ شاعری میں اگرچہ ان کا کوئی استاد نہیں تھا لیکن شعری ذوق انھیں قاضی محمد ذکی کی صحبت بدولت میسر آیا۔ شروع شروع میں ان کی شاعری بھی روایتی انداز کی ہی تھی جس میں حسن و عشق اور عاشق و محبوب کا رنگ غالب تھا لیکن بہت جلد اس میں ان کی انفرادیت نمایاں ہونے لگی۔ چونکہ ان کی ذاتی زندگی محنت مزدوری سے عبارت تھی، اس لیے وہی ان کی شاعری کا مرکز و محور بن گئی اور عوام الناس نے انھیں ''شاعر مزدور'' کے خطاب سے نواز دیا جو حقیقتاً ان کے شایان شان تھا۔ وہ ایسے شاعر مزدور نہیں تھے جن کی شاعری ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں جنم لیتی ہے۔ ان کی شاعری جگ بیتی نہیں بلکہ حرف بہ حرف آپ بیتی ہے جس میں ان کی ذات کا درد اور کرب قطعی نمایاں ہے۔ ان کی نظمیں ''باغی کا خواب'' اور ''سادھو کی چتا'' عوام میں بے حد مقبول ہوئیں جس نے انھیں بہت جلد مشاعروں کی مرکزی شخصیت بنا دیا۔ ان کی شاعری ہی میں نہیں بلکہ آواز میں بھی بلا کا سوز تھا جو سامعین پر سحر طاری کر دیتا تھا۔ علم عروض میں بھی انھیں کمال حاصل تھا اور ہر مصرعے کی بندش لاجواب ہوتی تھی۔ ان کے الفاظ کا ذخیرہ بحر بیکراں سے کم نہ تھا۔ فصاحت و بلاغت ان کا طرہ امتیاز تھا۔ واقعہ نگاری اور واردات کے بیان میں انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ غزل اور نظم دونوں ہی اصناف سخن پر انھیں یکساں عبور حاصل تھا۔

احسان دانش جتنے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی خود نوشت ''جہان دانش'' اس کی بہترین مثال ہے۔ ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد 80 سے بھی زیادہ ہے جبکہ ان کے مختلف مضامین کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ ''اردو مترادفات'' اور ''لغت الاصلاح'' اردو زبان کے حوالے سے ان کی انتہائی قابل قدر خدمات میں شمار کی جاتی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ڈگریاں علمیت و قابلیت کے لیے ہرگز لازم و ملزوم نہیں۔ حکومت پاکستان نے احسان دانش کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں 1978 میں انھیں تمغہ امتیاز سے نوازا تھا۔

احسان دانش 21 مارچ 1982 کو اس جہان فانی سے ملک عدم روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور درجات بلند فرمائے (آمین)

مایہ ناز ماہرِ تعلیم انیتا غلام علی

ہفتہ 19 اگست کی صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی ہم نے جب حسب معمول اخبار اٹھایا تو پروفیسر انیتا غلام علی کے سانحہ ارتحال کی خبر پڑھتے ہی ہمارے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا اور پھر کانوں میں ان کی برسوں پرانی یہ آواز یکایک "thisisRadioPakistan.hear'sthenewsreadbyAnitaGhulamAli" گونج اٹھی۔
ان کے ساتھ ہمارا اولین تعارف ریڈیو پاکستان میں ہی ہوا تھا جہاں وہ انگریزی کی خبریں پڑھنے کے لیے تشریف لایا کرتی تھیں۔ بلا شبہ وہ ایک منفرد نیوز کاسٹر تھیں جن کا لب و لہجہ انتہائی شائستہ اور Cultured تھا اور خبریں پڑھنے کا انداز بھی سب سے الگ تھا۔ ان کی آواز میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو سامعین کے دلوں کو موہ لیتی تھی۔ ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور تلفظ بھی مثالی تھا۔ ان کے Pauses اور Stresses بھی کمال کے ہوتے تھے اور ان کی خبریں پڑھنے کی روانی بھی قابل رشک تھی۔ ہمیں یاد نہیں کہ خبریں پڑھتے ہوئے وہ کبھی لڑکھڑائی ہوں یا کبھی Fumbling کا شکار ہوئی ہوں۔ وقت کی پابندی جو ریڈیو کا طرہ امتیاز ہے ان کی گھٹی میں شامل تھی۔ خبروں کے نشر ہونے کے مقررہ وقت سے بہت پہلے نیوز روم میں داخل ہونا اور پھر نہایت اطمینان اور انہماک کے ساتھ نیوز بلیٹن کی ریہرسل کرنا ان کے روٹین میں شامل تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ جوں ہی نیوز روم میں داخل ہوتی تھیں تو گویا ایک خوشبو اور روشنی سی ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ وہ خوش اخلاق اور خوش گلو ہی نہیں بلکہ انتہائی خوش گفتار اور ملنسار بھی تھیں۔ ریڈیو پاکستان کے عملے کے ساتھ ان کا برتاؤ ایک فیملی ممبر کا سا تھا۔ ہم میں سے جب بھی کسی کو ان سے کوئی کام پڑا انھوں نے اسے خصوصی ذاتی دلچسپی سے انجام دیا۔ ان کی شخصیت میں بڑی زبردست گہرائی اور دل پذیری تھی اور ان کی باتوں میں پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ ایسی Dignity اور جاذبیت ہم نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ جو کوئی ان سے ایک بار مل لیتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ریڈیو پاکستان کے ساتھ ان کا تعلق اٹوٹ تھا جو اس وقت تک قائم رہا جب اس کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ مگر ریڈیو پاکستان والوں کے ساتھ ان کا رشتہ تادم آخر برقرار رہا۔ وضع داری انیتا جی کی شخصیت کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت تھی جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور آج کے دور میں تو عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ افسوس کہ دنیا اب پروفیسر انیتا غلام علی جیسے لوگوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے وہ کم ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

لوگ اچھے ہیں بہت دل میں اتر جاتے ہیں
اک برائی ہے تو بس یہ ہے کہ مر جاتے ہیں

بلا شبہ انیتا غلام علی جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔ علامہ اقبال نے ایسے لوگوں کے بارے میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

انیتا غلام علی کا دائرہ احباب اور SocialCircle بڑا وسیع تھا۔ اس اعتبار سے اگر انھیں SocialActivist کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی پوری زندگی دوسروں کی خدمت کے لیے وقف تھی اور شاید اسی لیے انھوں نے فیملی لائف کا روگ نہیں پالا۔ اس حوالے سے ان کا موازنہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سے کیا جا سکتا ہے جن کی زندگی کا مشن بھی خدمت خلق خدا ہی تھا۔ بس فرق ان دونوں کے درمیان صرف اتنا ہی تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق نے شعبہ طب کا انتخاب کیا جبکہ پروفیسر انیتا غلام علی نے اپنے لیے تعلیم کے شعبے کا چناؤ کیا۔

پروفیسر انیتا غلام علی کا تعلق سندھ کے ایک مشہور و معروف گھرانے سے ہے۔ وہ 1938ء میں کراچی میں ایک سابقہ جج کے یہاں پیدا ہوئیں جسے دانشوروں کی کان کہا جائے تو شاید کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کراچی شہر سے انھیں ایک والہانہ لگاؤ تھا اور خود کو کراچی والی کہلاتے ہوئے وہ بڑا فخر محسوس کیا کرتی تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ بڑی زبردست ایتھلیٹ ہوا کرتی تھیں اور کھیل کود کی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہا کرتی تھیں۔ بعد میں وہ تعلیم کے شعبے میں سرگرم ہوگئیں اور پورے 24 سال تک سندھ ایجوکیشن فاؤنڈیشن (SEF) کے ساتھ وابستہ رہیں جس سے وہ انتقال سے صرف چند ماہ قبل ہی علیحدہ ہوئی تھیں۔ وہ ایک عرصے سے عارضہ قلب میں مبتلا تھیں جو آخر کار جان لیوا ثابت ہوا۔

زمانہ طالب علمی کے دوران انھوں نے اپنی نیٹ بال ٹیم کی کپتانی بھی کی۔ وہ ٹیبل ٹینس کی چیمپئن بھی رہیں اور انھوں نے بیڈ منٹن بھی خوب کھیلی۔ ان کی خاندانی رہائش گاہ کراچی کے ایک بہترین علاقے گارڈن ایسٹ میں واقع تھی جو بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی آخری آرام گاہ کے نزدیک واقع ہے۔

سندھ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے حوالے سے انھوں نے اساتذہ کرام کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں جن کا تذکرہ پروفیسر ریاض صدیقی مرحوم ہم سے ہر ملاقات میں نہایت اچھے اور تعریفی الفاظ میں کیا کرتے تھے۔

زمانہ طالب علمی میں انیتا جی کو فلموں کا بڑا شوق ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اسی شوق کی تکمیل کی خاطر وہ اکثر ہفتے کے روز اپنے کالج سے بوٹنی کی کلاس چھوڑ کر سینما کا رخ کرتی تھیں جہاں طالب علموں کے لیے رعایتی ٹکٹوں پر فلم دکھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح کا معاملہ سرجن محمد علی شاہ مرحوم کے ساتھ بھی تھا جن پر کرکٹ کا شوق جنون کی حد تک طاری تھا۔ اپنے زمانہ طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے مرحوم نے ہمیں ایک بار یہ بات مزے لے کر بتائی تھی کلاس روم کے باہر سے جب ان کے ساتھی انھیں کھڑکی سے کرکٹ بال دکھاتے تو ان کے پاس چپکے سے سلپ ہو کر چلے جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ شوق بڑی بری بلا ہے جس سے اچھوں اچھوں کو کوئی مفر نہیں۔

ٹیبل ٹینس کا شوق بھی زمانہ طالب علمی میں انکے سر پر بھوت کی طرح سوار ہوتا تھا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ اپنے کالج بیگ میں ٹیبل ٹینس کے ریکٹ اور جوتوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے لیے انھیں اپنی موٹی موٹی کالج کی کتابوں کے صفحات بھی پھاڑ پھاڑ کر پھینکنے پڑے۔ زمانہ طالب علمی کے یہ دلچسپ قصے وہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتی تھیں۔

ان کی مضطرب اور بے قرار فطرت نے انھیں کراچی یونیورسٹی کے مائیکروبائیولوجی کے شعبہ میں چین کا گوشہ مہیا کر دیا جہاں انھوں نے اول پوزیشن کے ساتھ امتحان میں کامیابی حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ محض ایک اعلیٰ درجے کی کھلاڑی اور ایتھلیٹ ہی نہیں بلکہ ایک زبردست قسم کی پڑھاکو طالبہ بھی ہیں۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات والی کہاوت انیتا پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ انھوں نے کھیل کے بعد تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ 1961ء میں وہ سندھ مسلم کالج کے ٹیچنگ اسٹاف میں شامل ہوئیں اور 1985ء تک اس ادارے کے ساتھ مسلسل وابستہ رہیں۔ اگرچہ اپنے طالب علموں کے ساتھ ان کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا لیکن پڑھائی کے معاملے میں وہ بڑی سخت گیر قسم کی استاد واقع ہوئی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ ان کے بال کھینچنے اور کان مروڑنے سے بھی نہیں ہچکچاتی تھیں۔ وہ ایک مثالی استاد تھیں اور اپنے شاگردوں کے مستقبل کو سنوارنے کے معاملے میں انتہائی مخلص تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد ان کو نہایت قدر اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے اکثر شاگرد بڑے بڑے عہدوں پر خدمات انجام دے رہے ہیں جن میں بہت سے سرکاری افسران شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انیتا جی کو بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ 1970ء کی تحریک اساتذہ میں انھوں نے پولیس کی لاٹھیاں بھی برداشت کیں اور ڈنڈے بھی کھائے اور حوالات کی سیر بھی کی لیکن اپنے موقف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹیں۔ ان کا موقف تھا کہ پرائیویٹ کالجوں کو قومیایا جائے تاکہ وہاں کے اساتذہ استحصالی مینجمنٹ کے پنجہ ستم سے آزاد ہو کر وہی تنخواہیں اور مراعات حاصل کر سکیں جو سرکاری کالجوں کے اساتذہ کرام کو میسر تھیں۔

ایس ایم کالج سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ٹیچرز فاؤنڈیشن کا ڈول ڈالا جس کا بنیادی مقصد بھی اساتذہ کرام کی فلاح و بہبود کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ 1996ء ممتاز علی بھٹو کی عبوری حکومت میں انھوں نے تین ماہ تک بحیثیت وزیر تعلیم صوبہ سندھ بھی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد 1999ء میں جنرل پرویز مشرف کے فوجی حکمرانوں کے دور میں بھی انھوں نے ایک عرصے تک اسی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ حکومت پاکستان کی جانب سے تعلیم کے شعبے میں ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ستارہ امتیاز کے اعزاز سے بھی نوازا گیا جس کی وہ بجا طور پر مستحق تھیں۔ ان کے لواحقین کی بہت بڑی تعداد ان کے ہزاروں سوگوار شاگردوں پر مشتمل ہے جو انھیں ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔

بابائے جمہوریت نوابزادہ نصر اللہ خان

بابائے جمہوریت نواب زادہ نصر اللہ خان کی گیارہویں برسی گزشتہ 26 ستمبر کو نہایت خاموشی کے ساتھ گزر گئی۔ افسوس صد افسوس کہ جمہوریت کے دعوے داروں اور علم برداروں نے اس موقع پر نہایت سرد مہری اور لاتعلقی کا مظاہرہ کیا جو محض ان کی اپنی بے حسی یا کم ظرفی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے نواب صاحب کی بلند پایہ شخصیت پر ہرگز کوئی آنچ نہیں آتی۔

مرحوم بے شمار ذاتی خوبیوں اور اوصاف کے مالک تھے۔ رواداری، وضعداری اور مہمان نوازی ان کا طرہ امتیاز تھی۔ وہ کئی اعتبار سے وطن عزیز کے دیگر سیاستدانوں سے قطعی مختلف تھے۔ لالچ، طمع اور ہوس اقتدار سے بے نیاز اور بالاتر۔ پاکستان کے ہر حکمراں کی یہ خواہش رہی کہ نواب زادہ صاحب اس کی حکومت کا حصہ بنیں مگر انھوں نے اقتدار کی سیاست کو ہمیشہ اپنی ٹھوکر میں رکھا اور ہر حکمراں کا سیاسی قبلہ درست کرنے کی کوشش کی۔ اس کی پاداش میں انھیں متعدد مرتبہ جیلوں کی ہوا بھی کھانی پڑی لیکن ان کے پائے استقامت میں کبھی لرزش نہیں آئی۔ وہ چاہتے تو خوب مال کماتے اور جائیدادوں پر جائیدادیں کھڑی کرتے مگر وہ اصلی تے وڈے نواب زادے تھے اور اپنی نوابی کا بھرم انھوں نے اپنی آخری سانس تک قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام آج بھی انتہائی عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ایک سچی، کھری، اصلی اور مکمل جمہوری حکومت مرحوم کا خواب تھا جو شاید کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اس اعتبار سے خوش قسمت سیاستداں کہی جاسکتی ہیں کیونکہ انھیں اپنے دور اقتدار میں نواب زادہ نصر اللہ خان کی حمایت حاصل رہی اور ان کی خواہش پر نواب صاحب نے کشمیر کمیٹی کی سربراہی قبول کرلی۔ مگر سچ پوچھیے تو انھوں نے اس کمیٹی کا سربراہ بن کر حق ادا کردیا کیونکہ انھوں نے جس انداز میں اس مسئلے کو بین الاقوامی سطح پر اٹھایا اور اجاگر کیا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ ہمیں یقین ہے کہ انھوں نے کشمیر کمیٹی کا سربراہ بننے کا فیصلہ اس مسئلے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اقوام متحدہ کی منظور کی ہوئی قراردادوں کے مطابق حل کرانے کے لیے ہی کیا ہوگا۔

وہ حکومت کا حصہ بننے کے بجائے ہمیشہ اپوزیشن کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ اپنے اس رویے کے باعث انھیں اس کی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ فوجی حکمرانوں کے خلاف انھوں نے نت نئے حربے استعمال کیے اور ایسی ایسی زبردست تحریکوں کی قیادت کی کہ بڑے بڑے آمر حیران و پریشان ہوکر رہ گئے۔ اس کی پاداش میں انھیں متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ملک کی شاید ہی کوئی ایسی جیل ہو جس کی ہوا نواب زادہ صاحب نے نہ کھائی ہو۔ ہمارے اکثر سیاست دان صرف جیل جانے کے خوف سے فوجی حکمرانوں کے ساتھ صلح و سمجھوتہ کرلیتے ہیں مگر نواب زادہ ان کے برعکس جیل جانے کیلئے ہر وقت کمر بستہ و تیار رہتے تھے۔ فوجی حکمرانوں کے مقابلے میں جمہوریت کا پرچم بلند کرنا ان کا سب سے بڑا وصف تھا جس کی بناپر انھیں سپہ سالار جمہوریت کہنا بالکل بجا اور درست ہوگا۔ مرحوم نے اپنے ہاتھوں سے جمہوریت کی جو شمع روشن کی ہے اسے بجھانے کی شاید اب کسی بھی فوجی آمر کو جرأت اور ہمت نہ ہوگی ماسوائے اس کے کہ ہمارے سیاستدانوں کی ذاتی رقابتوں اور رنجشوں کے نتیجے میں خدانخواستہ ایسا برا وقت آجائے۔ نواب زادہ نصر اللہ خان عزم و عمل اور

جہد مسلسل کا پیکر تھے۔ نہ بیماری ان کی راہ میں حائل ہوئی اور نہ پیرانہ سالی نے کبھی ان کا راستہ روکا یا ان کی رفتار کو سست کیا۔ لفظ "مایوسی" ان کی لغت سے تادم آخر خارج ہی رہا۔ وہ دل کے غنی اور درویش صفت انسان تھے۔ مال و دولت اور ثروت سے وہ ہمیشہ بے نیاز ہی رہے۔ سیاست انھوں نے اپنے خاندانی اثاثے فروخت کر کے چلائی۔ 1956 میں جب پاکستان کا پہلا دستور بنا تو اگرچہ نصر اللہ خان دستور ساز اسمبلی کا حصہ تو نہیں تھے تاہم اس کا تحفظ کرنے والوں میں وہ پیش پیش تھے۔ اس کے بعد 1958 میں جب جنرل ایوب خان نے فوجی حکمرانی کا آغاز کیا تو نواب صاحب انتہائی سرگرم عمل ہو گئے اور حسین شہید سہروردی کی سربراہی میں قائم سیاسی جماعت عوامی لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ پھر 1962 کے الیکشن میں وہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ فاطمہ جناح کی حمایت میں حزب اختلاف کو ایک الگ پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے میں بھی نہایت اہم کردار ادا کیا۔ سیاسی اتحاد بنانے میں انھیں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا جس میں NDF کے بعد DAC اور PDP انتہائی قابل ذکر ہیں۔ پی این اے اور ایم آر ڈی کی تحریکوں میں بھی ان کے سرگرم کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آل پارٹیز کانفرنس میں اے آر ڈی اور ایم ایم اے کو یکجا کرنا بھی ان ہی کا سیاسی کمال تھا۔ وطن عزیز میں انھیں جمہوریت کے قافلہ سالار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کا سیاست کے میدان میں سرگرم عمل رہنے کا عرصہ تقریباً پون صدی پر محیط ہے جس کے حوالے سے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

یہ پون صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے اور حالات حاضرہ کی نبض پر ان کی انگلیاں ہمہ وقت موجود رہتی تھیں۔

نواب زادہ نصر اللہ اپنی ذات میں ایک مکمل انجمن تھے اور نہایت اعلیٰ و عمدہ شعری ذوق کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کا حافظہ بڑا قوی تھا جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں پاکستان کے سیاسی اور جمہوری اتحادوں کی پوری تاریخ یاد تھی۔ ان کی رحلت سے وطن عزیز کی سیاست اور جمہوری جدوجہد کا سنہری اور سب سے تابناک باب بند ہو گیا۔ پاکستان اس وقت جس سنگین دور سے گزر رہا ہے اس میں نواب زادہ نصر اللہ خان کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بشری خامیوں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

فخرِ پاکستان عبد السّتار ایدھی

وطن عزیز میں آپ کو گنتی کے صرف چند لوگ ہی نظر آئیں گے جن میں عبدالستار ایدھی یقیناً سرفہرست ہیں۔ ایدھی صاحب کی شہرت اور مقبولیت کے ڈنکے صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ چار دانگ عالم میں بج رہے ہیں مگر موصوف صلہ اور ستائش کی تمنا سے بالکل ہی بے نیاز ہیں۔

CharityBeginsatHome انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے جسے ایدھی صاحب نے عملیت کا لباس پہنا کر حرف بہ حرف درست ثابت کر دکھایا۔ اگر چہ بنیادی طور پر ان کا تعلق ایک کاروباری برادری سے تھا مگر انھوں نے اپنے آبائی پیشے کو ترک کر کے خدمت خلق کا بار گراں اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ انھوں نے جوڑ توڑ کر کے ایک ایمبولینس خرید لی اور ہنگامی صورتحال کے شکار زخمیوں اور بیماروں کو اسپتال پہنچانے کے کار خیر کی شروعات کر دی۔ اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالنے والوں کے لیے انھوں نے ایدھی سینٹر کے آگے ایک Box Money رکھ دیا جسے عرف عام میں گلک کہا جاتا ہے۔ مخیّر حضرات حسب توفیق اس میں روپے پیسے ڈالنے لگے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایدھی صاحب نے دیگر شعبوں کا اضافہ کرنا بھی شروع کر دیا جس میں نوزائیدہ بچوں کی نگہداشت اور پرورش اور گمشدہ بچوں کی تلاش کا شعبہ بھی شامل ہے۔ ''یہ بچہ کس کا بچہ ہے'' کے زیر عنوان ایدھی صاحب کا اسپانسر کیا ہوا پروگرام عرصہ دراز تک نہایت پابندی کے ساتھ ریڈیو پاکستان سے مسلسل نشر ہوتا رہا جس کی بدولت ہزاروں بچھڑے ہوئے بچے صحیح سلامت اپنے اپنے گھروں کو واپس پہنچ گئے۔ اسی طرح ایدھی صاحب نے بے آسرا بچوں کے لیے چلڈرن ہوم اور نادار حاملہ خواتین کے لیے ''ایدھی میٹرنٹی ہوم'' بھی قائم کیے۔ ایدھی صاحب کا بے مثل ادارہ ایدھی فاؤنڈیشن اور بھی بہت سے فلاحی کام انجام دے رہا ہے جن کی تفصیلات کا یہ مختصر سا کالم متحمل نہیں ہو سکتا۔

جن تعفن آمیز اور سڑتی ہوئی لاشوں کے قریب جانے سے مردوں کے لواحقین بھی کتراتے ہیں انھیں سنبھالتے ہوئے ایدھی صاحب ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔۔ ایدھی صاحب کی ایمانداری اور دیانت داری بھی مثل ہے۔ آج کے اس پر آشوب دور میں جب بھائی بھائی پر اور باپ بیٹے پر اعتماد کرتے ہوئے ڈرتا ہے لوگ ایدھی صاحب کو بلا رسید طلب کیے ہوئے ہزاروں لاکھوں روپے کے عطیات دیتے ہوئے اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ 22 اکتوبر بدھ کے دن کراچی میں مشہور و معروف یورولوجسٹ ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی کے زیر نگرانی کراچی میں واقع SIUT کے ادارے کے زیر انتظام قائم کیے جانے والے عظیم الشان اور جدید ترین ٹرانسپلانٹ آپریٹنگ تھیٹر کمپلیکس کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ عبدالستار ایدھی اس پر وقار تقریب کے مہمان اعزازی تھے۔ سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس آپریٹنگ تھیٹر کمپلیکس کا نام ایدھی کی جوڑی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس تقریب میں نہ صرف بیگم بلقیس ایدھی بلکہ ایدھی فیملی کے چشم و چراغ فیصل ایدھی نے بھی شرکت کی۔ ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی نے ایدھی

فیملی کو خراج عقیدت و تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ کمپلیکس جوایدھی خاندان کی مالی اعانت سے تعمیر کیا گیا ہے گردوں کے مریضوں کے علاج معالجے میں بہت معاون ثابت ہوگا۔اس موقع پر ڈاکٹر رضوی نے 19 اکتوبر کے اس انتہائی ناخوشگوار اور شرمناک واقع کا بھی ذکر کیا جب 8 مسلح ڈاکوؤں نے صبح 10 بجے ایدھی صاحب کے کھارادر، کراچی کے آفس میں داخل ہوکر ایدھی صاحب کے سر پر پستول رکھنے کے بعد لاکر زتوڑے اور 5 کلو سونا اور کروڑوں روپے لوٹ کر لیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ہمارا معاشرہ اس قدر بے حس ہو چکا ہے کہ اس نے ایدھی صاحب جیسے شخص کو بھی نہیں بخشا، جس نے اپنی پوری زندگی دوسروں کی خدمت کے لیے وقف کی ہوئی ہے۔ایدھی صاحب جنھیں علالت کے باعث وہیل چیئر کی مدد سے اسٹیج تک پہنچایا گیا دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ شکر ہے کہ ڈاکوؤں نے مجھے جان سے نہیں مارا۔اگر وہ مجھے مار ڈالتے تو میں بھلا ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔انھوں نے ڈاکوؤں سے اپیل کی کہ وہ لوٹا ہوا روپیہ اور بیش قیمت مال واپس کردیں۔ان کا کہنا تھا کہ ڈاکوؤں نے یہ ڈاکا ان کی جیب پر نہیں ڈالا بلکہ اس حرکت کا ارتکاب کر کے انھوں نے ملک کے ان غریب عوام کو خدمت سے محروم کردیا ہے جن کی امداد کے لیے سخت محنت اور مشقت کے ذریعے یہ خطیر سرمایہ اکٹھا کیا گیا تھا۔مخیّر اور انسان دوست پاکستانیوں نے یہ گراں قدر عطیات اپنے ہم وطن غریب غربا مریضوں کے علاج معالجے کے لیے اپنی خون پسینے کی کمائی سے ادا کر کے جمع کرائے تھے۔

سب سے زیادہ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ڈکیتی کا یہ واقعہ دن دہاڑے کھارادر جیسے گنجان آباد علاقے میں ایدھی صاحب جیسے شخص کے ساتھ پیش آیا جو فخر پاکستان ہے۔اس انتہائی شرمناک واقعے کی مذمت کے طور پر نہ کسی کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی توفیق ہوئی اور نہ دھرنا دینے کی۔ یہ واقعہ علاقے کی پولیس کے منہ پر زوردار طمانچہ اور حکمرانوں کی بے حسی اور ناکامی کا منہ بولتا ہوا ثبوت ہے۔اس سانحہ عظیم کے حوالے سے اس کے سوائے بھلا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطاں سے کوئی بھول ہوئی ہے

سید احتشام حسین کی یاد میں

اردو کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ جن صف اول کے ناقدین نے اپنی تنقید نگاری کے ذریعے اس تحریک کے خدو خال واضح کرنے کی کوشش کی ان میں سید احتشام حسین کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت علمی وادبی شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر، افسانہ نگار، مترجم، سفر نامہ نگار سماجی مورخ اور تنقید نگار مگر ان کی سب سے زیادہ شہرت ان کی تنقید نگاری کی وجہ سے ہوئی جسے اگر ان کی بنیادی شناخت کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

انھوں نے 21 اپریل 1912 کو ہندوستان کے ضلع جونپور میں آنکھ کھولی۔ ان کے جد امجد سید شہاب شہنشاہ جلال الدین اکبر اعظم کے عہد حکمرانی میں ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ 1929 میں جب ان کے والد سید ابو جعفر کی وفات ہوئی تو اس وقت احتشام حسین نویں جماعت کے طالبعلم تھے، 1934 میں انھوں نے ہندوستان کی معروف یونیورسٹی یعنی الہٰ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ بڑے خوش نصیب تھے کہ یونیورسٹی میں انھیں ڈاکٹر اعجاز حسین اور فراق گورکھپوری جیسے عظیم استادوں کی رہنمائی اور شفقت میسر آئی جس نے ان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے۔ 1938 میں ایم۔ اے اردو کرنے کے بعد وہ لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے استاد کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے اور ان کا یہ تعلق 1961 تک برقرار رہا۔ پھر اس کے بعد وہ الہٰ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے جہاں انھوں نے 11 سال تک پڑھایا۔ یکم دسمبر 1972 کو الہٰ آباد میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ 1963 میں جب ہمیں اپنے ایک ذاتی کام سے الہٰ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو یہ بھی دسمبر ہی کا مہینہ تھا تب ہم نے ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے کی غرض سے الہٰ آباد کے ایک گنجان علاقے نخاس میں واقع ان کے در دولت پر حاضری دی تھی جو کہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی۔ ہم اگر اپنے اس دورہ الہٰ آباد کو ایک تاریخی دورہ کہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا کیونکہ اسی دورے میں ہم نے ہندوؤں کا وہ مقدس مقام بھی دیکھا جہاں گنگا اور جمنا کا ملن ہوتا ہے جسے عرف عام میں سنگم کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق دراصل یہ دو نہیں بلکہ تین دریاؤں کا سنگم ہے جس میں تیسرا دریا سرسوتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انسانی آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اس سنگم پر نہانے کے بعد تمام پاپ (گناہ) دھل جاتے ہیں اور انسان بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ہر 5 سال بعد کنبھ کا مشہور میلا لگتا ہے جس میں ہندوستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لاکھوں یاتری (زائرین) اپنے اپنے پاپ دھونے کیلئے اشنان (غسل) کرتے ہیں۔ ہماری ایک خواہش یہ بھی تھی کہ اپنے دورہ الہٰ آباد میں ہندوستان کے ممتاز فلم ایکٹر امیتابھ بچن کے پتا جی ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن جی سے بھی شرف باریابی حاصل کرتے جو ہندی زبان کے منفرد لب و لہجے کے کوی (شاعر) تھے اور جن کا ترنم بے مثل تھا اور جنھوں نے عمر خیام کی رباعیات کا ہندی میں نہایت خوبصورت منظوم ترجمہ کیا ہے مگر افسوس کہ وہ ان دنوں الہٰ آباد میں موجود نہیں تھے جس کے باعث ہماری یہ خواہش ناتمام ہی رہ گئی البتہ الہٰ آباد میں واقع ہندوستان کے پہلے وزیراعظم اور کانگریس کے سرکردہ رہنما پنڈت جواہر لعل نہرو کے دولت کدہ "آنند بھون" کو دیکھنے کی ہماری دیرینہ آرزو ضرور پوری ہو گئی۔ اردو کے ترقی پسند نقادوں کی فہرست میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر انصاری، عزیز احمد، ممتاز حسین اور سردار جعفری جیسے معروف لوگوں کے اسمائے گرامی شامل ہیں مگر احتشام حسین کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی متوازن فکر ہے۔ ان کا عالمانہ انداز ان کا خاص وصف ہے۔ ادب کے علاوہ انھیں دیگر

علوم مثلاً تاریخ، سیاسیات، عمرانیات اور اقتصادیات سے بھی گہرا شغف تھا جس کا عکس ان کی تحریروں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مارکسزم اور جدلیات سے بھی ان کی دلچسپی بہت گہری تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ: ''میں ادب کو زندگی کے تمام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ نہ قدیم ادب میں سب کچھ اچھا ہے اور نہ جدید ادب میں سب کچھ برا، نہ پرانے ادب میں خرابیاں ہیں اور نہ نئے ادب کا ہر لفظ قابل تعریف بلکہ جس طرح پرانے ادب میں مواد اور صورت کے میل سے پرانے مرقعے تیار ہوئے ہیں اسی طرح نئے ادب میں بھی الفاظ اور خیالات کی مدد سے دل کی بات کہی جاتی ہے۔'' ان کے مندرجہ بالا خیالات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ احتشام حسین تنقید کے حوالے سے زمانی حدود کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں عملی اور نظری دونوں طرح کی تنقید کے نمونے ہمیں ملتے ہیں۔ ادبی شخصیت پر نظری نظریات کا اطلاق کرتے ہوئے وہ نظیر اکبر آبادی کی مثال پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''نظیر کی شاعری میں انسان ایک زندہ اور متحرک، حساس اور مادی اسباب سے مسرور ہو جانیوالی مخلوق کی شکل میں نظر آتا ہے۔ ''آدمی نامہ'' میں انھوں نے مفلس عوام کے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے''۔ بعض تذکرہ نویسوں نے نظیر اکبر آبادی کیساتھ اس حد تک زیادتی کی ہے کہ انھیں شاعر ماننے سے ہی انکار کر دیا ہے لیکن احتشام صاحب کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ نظیر کے پرجوش مداح ہیں اور وہ نظیر کی شاعری کو تحسین و ستائش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کچھ نقاد حضرات ماضی کے ادبی سرمائے کو یکسر مسترد کرتے ہیں جس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ ادب سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ عہد میں تخلیق ہو رہے ہیں مگر احتشام حسین کا رویہ اس سے بہت مختلف ہے مثال کے طور پر ان کے مضمون بعنوان ''لکھنو۔ادبی مرکز'' سے درج ذیل اقتباس پیش ہے: ''غدر کے بعد لکھنو پر جو تباہی آئی وہ گو بظاہر ایک حکومت کے خاتمے کی صورت میں نمایاں ہوئی لیکن اصلاً اس تہذیب پر بھی اس کی گہری چوٹ پڑی جو سکون، فرصت، فارغ البالی اور خوشحالی چاہتی تھی۔ اسی لیے فوراً ہی اس کا تضاد نمایاں ہو گیا اور گو داستانوں نے جو طلسم باندھا اس میں اسی عہد فراغت کی تصویریں نگاہوں کے سامنے آتی ہیں جو غدر سے پہلے تھا لیکن اس کے مٹتے ہوئے اور ملمع اترے ہوئے نقوش سرشار کے ''فسانہ آزاد'' میں نظر آتے ہیں۔ غدر کے بعد لکھنو نے سرشار، نول کشور پریس، اودھ پنچ اور شرر کو پیدا کر کے اپنی مرکزیت برقرار ہی نہیں رکھی بلکہ اس میں تخلیقی اضافہ کیا اور کئی راہوں پر ملک کی ادبی زندگی کی رہنمائی کی'' احتشام حسین نے اپنے اسی نوع کے ایک اور مضمون ''خوجی۔ایک مطالعہ'' میں آزاد اور خوجی کے حوالے اپنے مخصوص تجزیاتی انداز میں ماضی کے تہذیبی تناظر کی بازیافت نہایت عمدگی سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''آزاد اور خوجی دونوں مل کر اس وقت کی زندگی کی تصویر بناتے ہیں۔ سرشار نے ایک ہی کردار کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔ ایک دوسرے کیلئے عقبی زمین کا کام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔'' احتشام حسین کے مضامین سے لیے گئے مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے تہذیب و تمدن کے زیر اثر تخلیق ہونیوالے ارباب کے محاسن و مصائب کا کھوج لگا کر ان کا بے لاگ تجزیہ کرتے ہیں اور مصائب کی وجہ سے پوری تہذیب اور اس سے وابستہ تخلیقی سرمائے کو یکسر رد نہیں کرتے بلکہ اس کے محاسن کی تعریف و تحسین بھی کرتے ہیں۔ احتشام حسین ایک ہمہ صفت اور ہمہ جہت نقاد تھے۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جنھیں بیشتر ترقی پسند ناقدین نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ ان کے نزدیک تنقید ایک مقدس فریضہ ہے اور یہ محض تعریف و توصیف یا محض تنقیص یا عیب نکالنے کا نام نہیں ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی یاد میں

مئی کے مہینے کو ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) کی ذات اور شخصیت سے ایک خصوصی نسبت ہے۔ مئی 1962 میں انھوں نے نائب صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔اس کے بعد 1967 میں جب وہ صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے تو تب بھی مئی کا ہی مہینہ تھا اور پھر اسی ماہ کی 9 تاریخ کو ان کی کامیابی کا اعلان ہوا جس کے بعد 13 مئی کو انھوں نے حلف وفاداری اٹھایا اور پھر جب سنیچر (ہفتہ) کے روز صبح کے سوا گیارہ بجے انھوں نے اس دار فانی سے کوچ کیا تو تب بھی مئی کا ہی مہینہ تھا اور تاریخ 3 تھی۔ یہ تاریخی منظر اس لحاظ سے بڑا عجیب اور یادگار تھا کہ یہ پہلا موقع تھا جب راشٹر پتی بھون (ایوان صدر) کے درودیوار قرآن مجید کی تلاوت سے گونج رہے تھے۔ ہزاروں اہل ایمان اور علمائے کرام نے ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی بلند پایہ اور ششش جہت شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

بلا شبہ وہ ایک مجموعہ صفات تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اولین شیخ الجامعہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر، صوبہ بہار کے گورنر اور پھر اس کے بعد بالترتیب نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہند مگر ان کی اولین اور آخری شناخت ایک بے مثل ماہر تعلیم کی تھی جس کا تمام چھوٹے بڑے اور اپنے پرائے سب ہی لوہا مانتے تھے۔ ان کی اسی امتیازی خصوصیت کی بنا پر گاندھی جی نے انھیں آزاد ہندوستان کا نظام تعلیم وضع کرنے کی سب سے بڑی ذمے داری سونپی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے تعلیمی ویژن اور علمی عظمت کا اندازہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی سے لگایا جاسکتا ہے جس کی تخم ریزی اور آبیاری انھوں نے اس انداز سے کی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا ہوا آج یہ ادارہ ایک مثالی درس گاہ بن چکا ہے جس کی شہرت کی گونج پورے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ دہرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، چہرے پر خوبصورت داڑھی، آنکھیں روشن، کشادہ پیشانی، چہرے سے ذہانت، متانت اور بلند نگاہی عیاں، جسم پر خوبصورت شیروانی اور سر پر کشتی نما سادہ مگر دیدہ زیب ٹوپی، یہ تھا ڈاکٹر صاحب کا پرکشش سراپا جس پر دیکھنے والے کی نظر پڑ جائے تو ہٹنے کا نام ہی نہ لے۔ ڈاکٹر صاحب جب جرمنی سے نئے نئے واپس آئے تھے تو انھوں نے مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خان کے بیحد اصرار پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل کی ذمے داری قبول کی تھی۔ اس وقت جامعہ ملیہ دہلی کے علاقے ترول باغ میں ہوا کرتی تھی جہاں سے اسے بعد میں دریائے جمنا کے کنارے واقع اوکھلا کے اس علاقے میں منتقل کر دیا جواب ذاکر صاحب ہی کے نام پر ذاکر نگر کہلاتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پرنسپل شپ کا ابتدائی دور ڈاکٹر صاحب کیلئے کڑی آزمائش کا دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جامعہ کی مالی حالت اچھی نہ تھی اور اس کا گزارا چند مخلص اور بے لوث معاونین کی مالی اعانت سے ہی ہو رہا تھا جن میں دہلی کے دو ممتاز تاجر ملک دین محمد اور محمد شفیع قریشی پیش پیش تھے۔ چنانچہ اس دور میں ذاکر صاحب ایثار و قربانی کی زندگی گزار رہے تھے اور وہ اپنی گزر اوقات کیلئے جامعہ سے جو کچھ بھی لیتے تھے وہ متوسط درجے کے ایک شخص کی آمدنی کے مقابلے میں بھی بہت کم اور ناکافی تھی۔ سچ پوچھئے تو بے مثل قربانی اور ایثار کا یہ جذبہ ہی تھا جس نے جامعہ ملیہ میں ایک نئی روح پھونک دی اور ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو تعلیمی حلقوں میں روشنی کے ایک عظیم الشان مینار کی صورت میں پیش کر دیا بالآخر ڈاکٹر صاحب کی محنت اور قربانیاں رنگ لائیں اور 15 تا 18 نومبر 1946 جامعہ کا وہ تاریخی جشن سیمیں منعقد ہوا جس میں ایک جانب صدر جلسہ

ہز ہائی نس نواب سر حمید اللہ خان آف بھوپال، سامنے والی قطار میں پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، بیرسٹر آصف علی اور سی راج گوپال آچاریہ بیٹھے ہوئے تھے تو ان ہی کے برابر سامنے والی صف میں محمد علی جناح، محترمہ فاطمہ جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر اور راجہ غضنفر علی خاں تشریف فرما تھے جبکہ ڈائس کی پچھلی صفوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، سر شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر عبدالحق اور حفیظ جالندھری جیسی شخصیات موجود تھیں۔ 1948 میں ڈاکٹر صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھلا چاہنے والوں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شدید خواہش پر یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ قبول کر لی اور جامعہ ملیہ کی ذمے داری اپنے قابل اعتماد رفیق کار پروفیسر محمد مجیب کے سپرد کر دی۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی انتہائی پر آشوب دور سے گزر رہی تھی۔ نتیجتاً یہ کٹھن ذمے داری قبول کرنا ڈاکٹر صاحب کیلئے عزت سادات کو داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ اگر چہ ڈاکٹر صاحب نے حالات کو سدھارنے اور معاملات کو سنبھالنے کیلئے اخلاص نیت کیساتھ بہت کچھ کرنے کی کوشش کی لیکن مجبوری کی نادیدہ بیڑیوں کے بندھنوں نے انھیں زیادہ کامیاب نہ ہونے دیا جس کے نتیجے میں بہت سی مایوسیوں اور ناکامیوں نے جنم لیا۔ بہار کی گورنری اور نائب صدر اور پھر صدر جمہوریہ ہند کے مناصب پر فائز ہونے کا معاملہ بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو ان مناسب پر فائز کر کے حکومت ہند نے تو خوب خوب سیاسی فوائد حاصل کیے مگر ڈاکٹر صاحب کی مسلمانوں کے حوالے سے شہرت اور ساکھ کو فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہی پہنچا۔ بہ قول شاعر:

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

واقفان حال بخوبی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے ہندوستان کے علمائے کرام سے انتہائی قریبی مراسم تھے اور وہ خلوص نیت سے چاہتے بھی تھے کہ وہ ان کی علمی اور دینی درسگاہوں کو اپنے تعلیمی تجربے اور ویژن سے فیض یاب بھی کریں لیکن افسوس وہ اپنی اس دلی خواہش کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ ڈاکٹر صاحب کے نظریات وافکار اور ان کے سیاسی رجحانات سے تو اختلاف کیا جاسکتا ہے تاہم ان کی بے پناہ قابلیت، علمیت، بلند پایہ شخصیت، انتہائی شرافت اور عظمت سے انکار ہر گز ممکن نہیں ہے۔ اس بات کا اندازہ صرف اس واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ نائب صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جب انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے جلسہ تقسیم اسناد سے سنسکرت زبان میں بے تکان خطاب کیا تو تمام حاضرین نے جن کی غالب اکثریت ہندو اور سکھ طلبا و طالبات، اساتذہ کرام اور اہل علم پر مشتمل تھی فرط حیرت سے اپنی انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سنسکرت زبان میں خطبہ اسناد دینے کی سابقہ روایت کو نہ صرف برقرار رکھ سکتے ہیں بلکہ اسے چار چاند لگا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سنسکرت بھی اسی روانی سے بول رہے تھے جس روانی سے وہ اپنی مادری زبان اردو یا انگریزی بولا کرتے تھے۔ یہ بات محض کانوں سنی نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی ہے کیونکہ ہم اس کے چشم دید گواہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی بے پناہ علمیت کا اس سے بڑا ثبوت بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔ سنسکرت زبان کے ایک انتہائی ادنٰی طالبعلم کی حیثیت سے عرض ہے کہ یہ ایک انتہائی دقیق اور مشکل زبان ہے جس کیلئے بڑی مشق اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندو اسے دیو بھاشا یعنی دیوتاؤں کی زبان کہتے ہیں اور ان کی مقدس کتاب والمیکی رامائن کا اصل نسخہ سنسکرت زبان ہی میں ہے جس کا مہا کوی تلسی داس نے ہندی جاننے والے عام ہندوؤں کی آسانی اور سہولت کی خاطر ہندی زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

مولانا محمدؐ علی جوہر

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر بے شمار صفات کا مجموعہ تھے۔ تحریک خلافت کے سپہ سالار کی حیثیت سے ان کا نام مثل خورشید تا قیامت روشن رہے گا۔ صحافت اور سیاست ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے قلم میں تلوار جیسی کاٹ تھی۔ اس لحاظ سے اگر انھیں صاحب سیف و قلم کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اردو میں ''ہمدرد'' اور انگریزی میں ''کامریڈ'' نامی بے مثل اخبارات میں انھوں نے اپنی قابلیت کے خوب خوب جوہر دکھائے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ محض گفتار کے ہی نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ وہ سر سے پیر تک ایک عملی انسان تھے جن کے قول و فعل میں ذرا سا بھی تضاد نہیں تھا۔ اس اعتبار سے وہ عہد حاضر کے سیاست دانوں اور صحافیوں سے قطعی مختلف تھے۔ ان کے یہاں سیاست اور صحافت دونوں کو ہی عبادت کا درجہ حاصل تھا۔ لہٰذا ان کے اوصاف اور خوبیوں کو بیان کرنا اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کا احاطہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

اسلام صرف ان کا دین نہیں بلکہ مقصد حیات اور زندگی بھر کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس حوالے سے ان کی زندگی کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں۔

1923 کا آخری زمانہ تھا۔ مولانا کراچی کے مشہور و معروف خالق دینا ہال میں چلنے والے تاریخی مقولے کے بعد دوسری بار اسیری سے رہا ہو کر تازہ تازہ دلی تشریف لائے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ان کی شہرت اور مقبولیت بام عروج پر تھی۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ اور شہر در شہر بس ان ہی کے چرچے تھے۔ کانگریس کے سرکردہ رہنما گاندھی جی کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان میں ان کی بھی جے جے کار ہو رہی تھی اور کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے متعدد صوبوں سے ان کا نام منظور ہو چکا تھا۔ ان حالات میں علی گڑھ کے ایک جلسہ عام سے خطاب کے دوران انھوں نے برجستہ فرمایا کہ عقائد کے اعتبار سے ایک عام فاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر فوقیت حاصل ہے۔ مولانا کے ان کلمات پر ہندو چراغ پا ہو گئے اور کانگریسی حلقوں میں تو ایک طوفانی ہلچل مچ گئی۔ بعض کانگریسی رہنماؤں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ ایسا فرقہ پرست شخص کانگریس کا بھلا کیسے بن سکتا ہے؟ محمد علی جوہر کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو گھبرا کر معذرت خواہی پر اتر آتا۔ مگر اللہ کا یہ شیر پوری جرأت اور استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔

مشہور و معروف امین الدولہ پارک کے ایک اہم جلسہ عام میں انھوں نے ببانگ دہل یہ بھی کہا کہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیے۔ ''جہاں تک سیاست کا تعلق ہے گاندھی جی ہم سب کے پیشوا ہیں لیکن جہاں تک مذہب کا تعلق ہے میرا یہی عقیدہ ہے کہ ایک فاسق و فاجر کلمہ گو بھی اپنے عقائد کے لحاظ سے تنہا مہاتما گاندھی ہی نہیں بلکہ دنیا جہان کے تمام بہتر سے بہتر سارے غیر مسلموں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔'' مولانا کی اس جرأت مندی کے نتیجے میں پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔

اسی طرح جب پونا کے ایک ہندو اخبار میں گئو رکھشا یعنی گائے کے تقدس کی حمایت میں ہندو انتہا پسند رہنما بال گنگا دھر تلک کے حمایت یافتہ ایڈیٹر این سی کی لکر کا ایک متعصبانہ مضمون شایع ہوا تو مولانا بری طرح تڑپ اٹھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کا مشہور انگریزی اخبار کامریڈ فرنگی حکومت کے زیر عتاب ہونے کی وجہ سے بند پڑا ہوا تھا۔ یہ اشتعال انگیز مضمون مسلمانوں کے لیے کسی دھمکی سے کم نہ تھا۔ چنانچہ مولانا نے فوراً اس کے جواب میں ایک زبردست خط تحریر کر کے کی لکر کو ارسال کرنے کے لیے اپنے سیکریٹری حسن محمد حیات کے حوالے کر دیا۔ اس خط کا لب لباب یہ تھا کہ اگر مسلمانوں پر ذرا بھی جبر کا کوئی پہلو پیدا ہوا تو میں پونا آکر خود اپنے ہاتھوں سے گائے ذبح کروں گا۔

اسی طرح انگریزوں کی حکومت کو للکارتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ''میری بغاوت اس وقت سے شروع ہونے لگتی ہے جب دین ومذہب میں حکومت کی مداخلت شروع ہو جاتی ہے۔''

ایک اور واقعہ 1928 کے درمیان کا ہے جب مولانا ذیابیطس کے علاج کے سلسلے میں فرانس اور برطانیہ گئے ہوئے تھے۔ایک روز لندن کے ایک اخبار میں یہ خبر چھپی کہ ایک مسلمان کو پارلیمنٹ کی گیلری میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا گیا جو کہ بالکل انوکھی بات تھی۔سب جان گئے کہ یہ مولانا محمد علی جوہر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مولانا پر بس یہی دھن سوار تھی کہ پورا یورپ گھومیں اور قرآن کے انمول خزانے کو ایک ایک شخص تک پہنچائیں اور ہر اسٹیشن، ہر پارک اور ہر چوراہے پر نماز ادا کر کے لوگوں کو دین اسلام کے ابدی پیغام سے روشناس کرائیں۔

اسی سلسلے کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔غالباً شب کا پچھلا پہر تھا۔ستارے آسمان پر ٹمٹمارہے تھے۔اس وقت مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی صاحب خانہ کعبہ کے پاس سے ہو کر گزر رہے تھے۔دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص نہایت عاجزی اور دلسوزی کے ساتھ گریہ وزاری میں مصروف ہے۔آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک جھڑی لگی ہوئی ہے جو تھمنے کا نام نہیں لے رہی۔آواز بیٹھی ہوئی اور گردن سجدے میں جھکی ہوئی ہے۔وہ شخص گڑگڑا کر اور رورو کر پکار رہا تھا کہ ''اے کارساز عالم چاہے تو میری کوئی اور آرزو پوری نہ کر، لیکن ایک بار ان آنکھوں کے سامنے خلافت راشدہ کا احیاء کر کے وہ مبارک اور مسعود زمانہ واپس لاکر دکھادے جس کا ذکر ہم نے صرف کانوں سے سنا ہے مگر آنکھیں جس کی دید سے اب تک محروم ہیں۔''

مفتی اعظم فلسطین کا بیان ہے کہ میں حیرت سے یہ عجیب وغریب منظر دیکھ رہا تھا۔پھر جب اس شخص نے اپنی پیشانی سجدے سے اٹھائی تو دیکھتا کیا ہوں کہ یہ مولانا محمد علی جوہر تھے جن کا نورانی چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد علی کو شاعری کی نعمت سے بھی نوازا تھا اور جوہر ان کا تخلص تھا۔اس بے بہا نعمت سے بھی انھوں نے وہی کام لیا جو ایک مرد مومن کے شایان شان تھا۔ان کی شاعری واردات قلب سے عبارت ہے اور یہ ان کے دل کی زبان اور جذبہ صادق کی ترجمان ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے و لے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

استاد بندو خان... شخصیت و فن

بر صغیر پاک و ہند نے بڑے بڑے نامور استادان فن اور یکتائے روزگار موسیقار پیدا کیے ہیں جن کے نام دنیائے موسیقی میں تا قیامت روشن و درخشاں رہیں گے۔ فخر موسیقی سارنگی نواز استاد بندو خاں کا نام بھی امتیازی شان کے ساتھ اس طویل فہرست میں شامل ہے۔ وہ اس دلی گھرانے کے چشم و چراغ تھے جس نے استاد ممن خاں نامی عظیم موسیقار پیدا کیا، جس نے ''سرساگر'' نامی سارنگی ایجاد کی تھی۔ ممن خاں محض ایک بے مثل موسیقار ہی نہیں بلکہ ایک درویش صفت پرہیزگار اور عبادت گزار مسلمان بھی تھے۔

استاد بندو خاں کے گھرانے کے ڈانڈے دلی کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر کے مغلیہ دربار سے جاکر ملتے ہیں جہاں ان کے دادا علی بخش خاں کو ایک بلند مقام حاصل تھا اور ان کی سارنگی سے شاہی در و دیوار گونجتے تھے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے علی جان خاں نے اپنے خاندان کے پرچم کو بلند رکھا جو نہ صرف استاد بندو خاں کے والد گرامی بلکہ ان کے استاد بھی تھے۔ بندو خاں نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔

بندو خاں نے 1880ء میں اپنے نامی گرامی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ چناں چہ سارنگی ان کے وجود میں رچی بسی ہوئی تھی۔ صرف سات برس کی عمر میں جو کہ کھیل کود کی عمر کہلاتی ہے انھوں نے سارنگی کے تاروں کو جھنجھنانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی محنت اور ریاض کئی کئی گھنٹوں کے دورانیے پر محیط تھا۔ ''پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں'' پرانی کہاوت بندو خاں پر حرف بہ حرف صادق آئی۔ ان کے جوہر شناس دادا نے بہت جلد اپنے ہونہار پوتے کی غیر معمولی صلاحیت اور شدت شوق کو اچھی طرح سے بھانپ لیا۔ بس پھر کیا تھا انھوں نے اپنا ورثہ اس بچے کو منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ان کی کوشش تھی کہ ان کا لائق پوتا سارنگی کے تمام نشیب و فراز سے کم سے کم وقت میں واقف ہو جائے۔ بندو خاں کا ذہن شروع ہی سے بہت زرخیز اور بڑا تخلیقی تھا۔ وہ پیدائشی طور پر ایک Creative ذہن کے مالک تھے۔ وہ اکثر یہی سوچا کرتے تھے کہ دوسرے سازوں کے باج کو سارنگی میں کس طرح ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس کٹھن کام کو سرانجام دینے کیلئے انھوں نے موسیقی کے ایک ایک ساز کے باج پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جب وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے اس تجربے میں جن سازوں کو شامل کیا ان میں رباب، الغوزہ، دل ربا اور ستار شامل ہیں۔ ان کی اس کاوش نے سارنگی کو ایک نئی جہت سے ہم آہنگ کر کے عملاً ''سورنگی'' بنا دیا۔

انگلیوں کی ضرب جس طرح ہارمونیم میں لگائی جاتی ہے بندو خاں نے ویسی ہی ضرب سارنگی میں بھی لگانا شروع کر دی۔ انھوں نے اس جدت طرازی سے بڑے بڑوں کو حیران کر دیا۔ انھوں نے مینڈ سوت کی سرگم کا انداز بھی بدل دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے سارنگی کی ساخت کے حوالے سے بھی کامیاب تجربے کیے۔ انھوں نے مختلف قسم کے بانس پر ایک نئی طرح کی سارنگی وضع کی اور اس پر تانت کے تار چڑھائے۔ مگر جب سارنگی نہیں بولی تو انھوں نے فولاد کے تار آزمائے جس سے بڑی پیاری اور مسحور کن آواز پیدا ہوئی۔ جس طرح خاکستر گل سے خوشبو کا خمیر اٹھتا ہے بالکل اسی طرح موسیقی کی جدت طرازی ان کے خون میں شامل تھی۔ بس یوں کہہ لیجیے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

ان کی شہرت کی خوشبو دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف پھیلتی چلی گئی۔ بلا شبہ ان کی اس پذیرائی میں ان کی خداداد صلاحیت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بھی برابر شامل تھا۔ بہ قول شاعر:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس زمانے میں راجے اور مہاراجے فنکاروں کی بڑی قدر اور حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ استاد بندو خاں کے ساتھ بھی یہی کچھ پیش آیا۔ خوش قسمتی سے انھیں اندور کے مہاراجہ کی سرپرستی میسر آ گئی جس کے طفیل انھوں نے پورے ستائیس سال راجہ کے دربار کی ملازمت میں عزت و وقار کے ساتھ گزارے۔ یہ ان کی فنکارانہ زندگی کا سنہری دور تھا۔ وہ مہاراجہ کی آنکھ کا تارا تھے۔ اس کے بعد جب مہاراجہ نے راج پاٹ سے علیحدگی اختیار کر کے امریکا کا رخ کیا تو انھوں نے استاد کو بھی ہمراہ چلنے کی پیشکش کی جسے انھوں نے قبول نہیں کیا۔ تاہم اس کے باوجود انھیں عرصہ دراز تک باقاعدہ پنشن ملتی رہی۔ بالآخر انھوں نے پھر دلی ہی کا رخ کیا اور سنگیت سیوا شروع کر دی۔

ان کی شاگردی اختیار کرنے والے سنگیت پریمیوں کی تعداد میں بہت تیزی کیساتھ اضافہ ہونا شروع ہو گیا جن میں اگرچہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے تاہم ان کے چیلوں کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ پھر جب پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو استاد بندو خاں نے بھی مملکت خداداد ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت ہند نے بڑی کوشش کی کہ وہ یہ ارادہ ترک کر دیں۔ شنید ہے کہ اس سلسلے میں انھیں بڑی پرکشش پیشکشیں بھی کی گئیں لیکن ان کے سر پر تو پاکستان کی محبت سوار تھی جس کے نتیجے میں وہ قیام پاکستان کے محض چند ماہ بعد ہی بذریعہ ہوائی جہاز لاہور آ گئے جو تقسیم ہند سے قبل سے ہی فلم و موسیقی کا مرکز تھا۔ لاہور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد انھوں نے کراچی کا رخ کیا جہاں ہندوستان سے آنیوالے مہاجرین کی غالب اکثریت آ کر آباد ہوئی۔ ان کے علاوہ شاہد احمد دہلوی سمیت کئی نامور ہستیوں نے بھی کراچی میں ہی سکونت اختیار کی اور اس شہر کو اپنا آخری مسکن بنایا۔

کراچی آنے کے بعد استاد بندو خاں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے جہاں بابائے نشریات زیڈ اے بخاری نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ریڈیو پاکستان کے ساتھ ان کی وابستگی مسلسل جاری رہی تا آں کہ 1955ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہ یہیں پر سپرد خاک ہوئے گویا:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

وہ ان خوش نصیب فنکاروں میں شامل ہیں جن کی نہ صرف ان کی زندگی میں پذیرائی ہوئی بلکہ بعد از وفات بھی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ حکومت پاکستان کی جانب سے ان کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں 1956ء میں انھیں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد ملک میں ریڈیو پاکستان ہی وہ ادارہ تھا جس نے شاعروں، ادیبوں، گلوکاروں، موسیقاروں اور دیگر فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور پرورش کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے بعد پاکستان ٹیلی ویژن نے اس سلسلے میں اپنے حصے کی ذمے داری سنبھالی اور فنکاروں کی سرپرستی کے سائبان کو وسیع تر کرایا۔ استاد بندو خاں کی وفات کے بعد ان کے لائق فرزندوں امراؤ بندو خاں اور بلند اقبال نے اپنے بزرگوں کی روایت کو برقرار رکھنے کا حق ادا کر دیا بلکہ بلند اقبال نے تو پاکستان کی فلمی دنیا میں بھی اپنے بزرگوں کا نام روشن کر دیا۔ استاد بندو خاں اس اعتبار سے بھی بڑے خوش نصیب ہیں کہ بھارت اور پاکستان میں ان کے فن کے بارے میں نہ صرف کئی کتابیں شایع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں بلکہ بھارت میں تو ان کے فن پر ریسرچ بھی کی جا رہی ہے۔ اپنے درخشاں عہد میں انھیں استاد اللہ بندے خاں، استاد ذاکر الدین، استاد عبدالکریم خاں، استاد رجب علی خاں، استاد عبدالوحید خاں، استاد چاند خاں اور استاد بڑے غلام علی خاں جیسے نابغہ روزگار فنکاروں کی سنگت کا شرف بھی حاصل ہے۔ بھارت میں تو کلاسیکی موسیقی کو آج بھی وہی مقام حاصل ہے مگر ادھر پاکستان میں جب سے مغربی موسیقی کی یلغار شروع ہوئی ہے کلاسیکل گائیکی اور موسیقی کا مستقبل محفوظ نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں بے چاری سارنگی کب تک زندہ رہے گی اس سوال کا جواب دینا بڑا مشکل ہے؟

خشونت سنگھ بھی چل بسے

معروف بھارتی صحافی، دانشور، ادیب اور ''ٹرین ٹو پاکستان'' نامی بیسٹ سیلر کتاب کے خالق خوشونت سنگھ بھی چل بسے۔ وہ اپنی رنگارنگ زندگی کی بھرپور اننگز کھیلتے ہوئے 99 سال کے اسکور پر آؤٹ ہوگئے۔ انھوں نے اپنے پسماندگان میں ایک بیٹا راہل اور ایک بیٹی چھوڑی ہے جس کا نام مالا ہے۔ وہ کافی دنوں سے صاحب فراش تھے اور ان کی حالت میں آنے والے اتار چڑھاؤ کی خبریں وقفے وقفے سے آتی رہتی تھیں۔ وہ سانس لینے میں بڑی تکلیف محسوس کررہے تھے مگر لکھنے کا سلسلہ انھوں نے اپنی آخری سانس تک جاری رکھا۔

ان کی عجیب و غریب شخصیت کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقریباً 80 سال قبل انھوں نے ''پس مرگ'' کے عنوان سے ایک خوبصورت افسانہ تحریر کیا تھا جس میں انھوں نے اپنی علالت اور موت کے بعد کی منظر کشی بڑے عجیب انداز میں کی تھی اور پریس کوریج کے حوالے سے اپنی موت کی خبر کی سرخی بھی تجویز کردی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ''میں بخار کی وجہ سے بستر میں پڑا تھا۔ میں اکیلا اور فکرمند تھا کہ اگر ٹمپریچر اچانک بڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ شاید میں مرجاؤں۔ میری موت میرے دوستوں کے لیے حقیقتاً گراں ہوگی۔ میرے بہت سے دوست ہیں اور میں بہت مقبول ہوں۔ میں نے سوچا کہ اس حوالے سے اخبارات کیا لکھیں گے؟ وہ مجھے نظرانداز نہیں کرسکتے۔ ممکن ہے کہ سب سے بڑا اخبار اپنے صفحہ اول پر اس خبر کو میری تصویر کے ساتھ شایع کرے''۔ ''ایکسپریس'' نے ان کی وفات کی خبر کو صفحہ اول پر تصویر کے ساتھ شایع کرکے ان کی بات کو حرف بہ حرف درست ثابت کردیا۔ سچ پوچھیے تو ''ایکسپریس'' کا یہ طرز عمل آنجہانی کی عظمت کا سچا اور کھلا اعتراف ہے جو اس منفرد روزنامے کی سوچ اور پالیسی کا آئینہ دار ہے۔

خوشونت سنگھ کے پڑھنے والوں اور دوستوں و احباب کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ چناں چہ زندگی بھر کوئی غم نہ پالنے والے اس بے مثل لکھاری نے داغ مفارقت دے کر اپنے بے شمار مداحوں اور چاہنے والے پس ماندگان پر مشتمل ایک بہت بڑے خاندان کو سوگوار چھوڑا ہے۔

خوشونت سنگھ تقسیم سے قبل 2 فروری 1915 ضلع سرگودھا کے قصبہ ہڈالی میں پیدا ہوئے، جہاں سے ان کا خاندان قیام پاکستان کے وقت ترک وطن کرکے بھارت جاکر رہائش پذیر ہوگیا تھا۔ ان کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا اور ان کے پتاجی سردار سوبھا سنگھ ایک بہت بڑے بلڈر تھے۔ ہندوستان کی راجدھانی نئی دلی کی تعمیر کے دوران انھوں نے ٹھیکیداری کے پیشے سے خوب نام بھی کمایا اور مال بھی بنایا۔ لہٰذا خوشونت سنگھ نے بڑی خوشحال زندگی گزاری اور ہر قسم کی فکر و پریشانی سے آزاد رہے۔ خوشونت سنگھ کی زندگی کا ایک طویل عرصہ دہلی میں گزرا۔ غالباً یہ دہلی کے ساتھ ان کا گہرا لگاؤ تھا جس نے انھیں دہلی کی تاریخ کے حوالے سے ایک کتاب بھی لکھنے پر مجبور کیا جو ایک سے زیادہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کی اس کتاب کو دنیا بھر میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ دلی کی تاریخ کے مختلف ادوار کے ساتھ ساتھ ان کی اس شہرہ آفاق کتاب میں اس عظیم الشان شہر کی بعض اہم شخصیات کا تذکرہ بھی نہایت دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے جس میں خدائے سخن میر تقی میر کی نوجوانی کی تصویرکشی بھی انتہائی متاثر کن الفاظ میں کی گئی ہے۔ اگرچہ خوشونت مذہباً سکھ تھے لیکن عملی زندگی کے اعتبار سے وہ بالکل وسیع المشرب انسان تھے۔ پاکستان کے ایک ممتاز قانون داں اور سابق وزیر خارجہ بیرسٹر منظور قادر سے ان کے بڑے گہرے مراسم رہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ 1947 کے فسادات کے موقع پر یہ منظور قادر ہی تھے جو اپنی جان پر کھیل کر انھیں بحفاظت سرحد پار چھوڑ کر آئے تھے۔ خوشونت سنگھ نے اپنے کیریئر کا آغاز وکالت کے پیشے سے کیا مگر طبیعت اس طرف زیادہ مائل نہ ہوئی جس کے بعد انھوں نے قلم سنبھالا اور صحافت و ادب کے میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ ایک مصنف کی حیثیت سے انھیں اولین شہرت برصغیر کی تقسیم پر مبنی انگریزی ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' سے حاصل ہوئی۔ تاریخ پر بھی ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ ''ہسٹری آف سکھس'' کے عنوان سے انھوں نے سکھ مذہب کی تاریخ بھی مرتب کی ان کی دیگر انگریزی کتابوں میں

"the Bad and the Ridiculous" کے علاوہ "I Shall Not Hear the Nightingale" "The Good" اور "" Black Jasmine" قابل ذکر ہیں۔ان کی خود نوشت "andaLittleMalice, Truth,Love" بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

صحافت کے میدان میں بھی خوشونت سنگھ نے بڑانام پیدا کیا۔1970 سے 1980 کے دوران وہ ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبارات ''ہندوستان ٹائمز'' اور ''نیشنل ہیرالڈ'' کے ایڈیٹر رہے۔اس کے علاوہ انھوں نے کئی مشہور ادبی اور نیوز میگزینوں کی ادارت بھی کی جن میں ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' نامی ہفت روزہ نیوز میگزین سب سے زیادہ قابل ذکر ہے جو دنیا بھر کے انگریزی قارئین کا پسندیدہ نیوز میگزین تھا۔ان کی ہر تحریر پر ان کی چھاپ ہمیشہ ہی نمایاں ہوتی تھی۔95 سال کی عمر میں بھی ان کا قلم نت نئے موضوعات پر مضامین پر مضامین اگلتا رہا۔

اسی دوران ان کا خوبصورت ناول "TheSunsetClub" بھی شایع ہوکر منظر عام پر آیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ۔ پنشنرز کا ایک گروپ اس ناول کا اصل موضوع تھا۔ وزیراعظم اندرا گاندھی کی جانب سے ایمرجنسی کے نفاذ کے موقع پر انھوں نے سنجے گاندھی کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے وہ متنازع قرار پائے اور ان کے امیج کو بھی اس اقدام سے زک پہنچی۔ لیکن 1984 میں جب اندرا گاندھی کے حکم پر امرتسر کے تاریخی گولڈن ٹیمپل پر بھارتی افواج نے ''آپریشن بلیو اسٹار'' کے تحت دھاوا بول دیا تو خوشونت سنگھ نے شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے پدم بھوشن کا وہ قومی ایوارڈ واپس کر دیا جو انھیں ان کی اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد پر حکومت ہندوستان نے 1974 میں دیا تھا۔اس سے نہ صرف ان کی کھوئی ہوئی ساکھ بہت حد تک بحال ہو گئی بلکہ ان کی مقبولیت کا گراف ایک مرتبہ پھر اپنی سابقہ بلندیوں پر پہنچ گیا۔ 2007 میں ان کی بہترین تخلیقی خدمات کے اعتراف میں پدم وبھوشن کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ لیکن ان کے لیے سب سے بڑا ایوارڈ ان کی وہ مقبولیت تھی جو انھیں خواص وعوام میں یکساں حاصل تھی۔

خوشونت سنگھ انتہائی بولڈ اور بڑے بے باک صحافی اور قلمکار تھے۔ مصلحت کوشی ان کے خون میں شامل نہیں تھی ۔وہ جو بات بھی کہتے تھے ڈنکے کی چوٹ پر کہتے تھے۔بہ قول اقبال:

قند میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا

چاپلوسی اور بنیاد پرستی سے انھیں سخت چڑ تھی۔ چناں چہ جب انتہا پسند ہندو رہنما ایل کے ایڈوانی نے رتھ یاترا کی آڑ میں تعصب پسندی کے شعلوں کو ہوا دی تو خوشونت سنگھ نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔1980 سے 1986 تک وہ بھارت کے ایوان بالا راجیہ سبھا کے سرگرم رکن بھی رہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی خوشونت سنگھ صاحب کی ایک بہت بڑی خوبی تھی۔ جس کا ذاتی مشاہدہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم نے اپنی انگریزی نظموں کی کتاب Shadows راجیہ سبھا کے ڈپٹی اسپیکر سردار حکم سنگھ کے ہاتھوں انھیں دلی بھجوائی جو ایک تقریب میں شرکت کے لیے اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔ ہماری اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب صرف ایک ہفتے بعد خوشونت سنگھ کا محبت بھرا اور حوصلہ افزائی سے بھرپور خط بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔

خوشونت سنگھ ایک صاحب طرز ادیب ہی نہیں بلکہ ایک بے مثل صحافی بھی تھے۔اپنی تحریروں کا معاوضہ کرنے والوں میں بھی وہ سرفہرست تھے اور بجا طور پر اس کے حقدار بھی تھے۔

شاعری کرکٹر امتیاز احمد کا ایک اور طرہ امتیاز

ہمارے مایہ ناز کھلاڑیوں نے محض کھیل کے میدان میں ہی نہیں بلکہ دیگر میدانوں میں بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ مثال کے طور پر عمران خان کو ہی لے لیجیے جو کرکٹ میں پاکستان کا نام روشن کرنے کے بعد خدمت خلق اور اس کے بعد اب سیاست کے میدان میں بھی اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہی بات پاکستان ہاکی کے مایہ ناز کھلاڑی اور سابق کپتان اولمپیئن اختر رسول کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جنہیں میدان سیاست میں اترے ہوئے ایک عرصہ دراز ہو چکا ہے۔ پاکستان ہاکی کے ایک اور سپر اسٹار قمر زمان کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ دوسری جانب سابق کرکٹر اور سلیکٹر محسن حسن خان ہیں جنھوں نے پہلے ایک بھارتی فلمی اداکارہ سے شادی کر کے شہرت حاصل کی اور پھر اس کے بعد بذات خود بھی فلمی میدان میں اپنی اداکاری کا لوہا منوایا۔ اسی طرح ماضی کے ایک عظیم وکٹ کیپر بلے باز تسلیم عارف بھی گائیکی کے شعبے میں اپنی خداداد صلاحیت کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

اس حوالے سے کرکٹ لیجنڈ کھلاڑی امتیاز احمد کو اگر چھپا رستم کہا جائے تو شاید کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ ہمیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب پاکستان کی کرکٹ ٹیم فضل محمود کی کپتانی میں بھارت کے دورے پر گئی ہوئی تھی تو تب دلی کے فیروز شاہ کوٹلہ گراؤنڈ میں کھیلے جانے والے ٹیسٹ میچ کی کمنٹری کرتے ہوئے اپنے وقت کے ممتاز کرکٹ کمنٹیٹر بھارت کے مہاراج کمار وزیا نگرم نے جو وزی کے نام سے جانے جاتے تھے امتیاز احمد کا ریڈیو پر سامعین سے تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ ”ہمارے کھلاڑیوں کو امتیاز احمد سے سیکھنا چاہیے کہ بلا کیسے پکڑا جاتا ہے، بال کو کیسے کھیلا جاتا ہے اور وکٹ کیپنگ کس طرح کی جاتی ہے۔“ بلا شبہ وزی صاحب نے امتیاز صاحب کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ امتیاز پاکستان کرکٹ اور پاکستانی فضائیہ کے لیے ہی نہیں بلکہ شاعری کے لیے بھی طرہ امتیاز ہیں۔ امتیاز احمد عرصہ دراز سے سخنوری فرما رہے ہیں جس کے متعلق مولانا حسرت موہانی کی روح سے معذرت طلب کرتے ہوئے ہم یہی عرض کر سکتے ہیں کہ:

ہے مشق سخن جاری
کرکٹ کی مشقت بھی

اگر امتیاز احمد نے کرکٹ کے بجائے شاعری کو اولیت دی ہوتی تو معلوم نہیں کتنے شاعروں کے چھکے چھڑا دیے ہوتے اور کتنوں کو شاعری میں اسٹمپ آؤٹ کر دیا ہوتا۔ ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ بات انکشاف کا درجہ رکھتی ہو کہ امتیاز احمد ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں اور ”میرے شعر“ کے زیر عنوان ان کا مجموعہ کلام عرصہ دراز قبل شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ امتیاز احمد کے اس دیوان پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے بے مثل طنز و مزاح نگار شوکت تھانوی نے کہا تھا کہ ”امتیاز ایسا کرکٹ کا کھلاڑی اگر صاحب دیوان بن سکتا ہے تو حفیظ جالندھری اور خواجہ دل محمد کو آئندہ سال ٹیسٹ میچز کھیلنے پاکستانی ٹیم کے ساتھ ولایت بھیجنا پڑے گا۔ اس کے لیے امتیاز احمد کل پاکستان مشاعرے میں شرکت کا وعدہ کر چکے ہوں گے اور عبدالحفیظ کاردار شاہنامہ کی باقی جلدیں لکھنے میں یہ کہہ کر مصروف ہو جائیں گے کہ کرکٹ ٹیم کو ایک حفیظ چاہیے، وہ کاردار نہ سہی جالندھری سہی اور دنیائے شعر کو ایک حفیظ چاہیے وہ جالندھری نہ سہی کاردار سہی۔ نتیجہ یہ کہ فضل احمد کریم فضلی کی اسکور بک شائع ہوا کرے گی اور فضل محمود کی چشم غزل۔ وقار انبالوی وقار حسن کی جگہ لے لیں گے اور علیم الدین علم الدین سالک کی۔“

امتیاز احمد کے شعری مجموعے کے حوالے سے شوکت تھانوی آگے رقم طراز ہیں کہ ''اس کتاب کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کرکٹ کے آئین مشاعروں میں نافذ ہو جائیں اور آداب مشاعرہ کا رواج کرکٹ کے میدان میں شروع ہو جائے تو عجیب و غریب انقلاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مشاعروں میں تو خیر اب بھی اکثر چوکے اور چھکے لگ جایا کرتے ہیں اور بہت سے شاعر مائیکروفون پر آکر ایل بی ڈبلیو ہو جایا کرتے ہیں، مگر اس انقلاب کے بعد تو نقشہ ہی کچھ اور ہو جائے گا کہ کرکٹ کے میدان میں فضل محمود گیند لیے کھڑے ہیں اور تماشائیوں سے کہہ رہے ہیں ''عرض کرتا ہوں شاید کسی قابل ہو'' اور یہ کہہ کر جو دوڑ کر گیند پھینکتے ہیں تو وکٹ اڑتا ہے تو ہر طرف سے سبحان اللہ، واہ وا، کیا خوب فرمایا ہے مکرر ارشاد کا ایک شور برپا ہو گیا اور فضل محمود نے ہر طرف فرشی سلام کرنے کے بعد ''مکرر ارشاد'' کی تعمیل میں پھر وہی گیند پھینک کر اسی طرح وکٹ اڑایا۔ یا حنیف نے ایک چھکا مارا تو ہر طرف سے داد کا شور اٹھا کہ ''ارے سبحان اللہ کیا برجستہ چھکا ارشاد ہوا ہے۔ زحمت تو ہو گی ایک مرتبہ پھر اور حنیف نے آداب بجا لا کر اور انکسار سے ''میں کس قابل ہوں'' کہہ کر پھر وہی چھکا مارا تو پھر شور اٹھا کہ ''حقیقی سیری نہیں ہوئی، ایک مرتبہ تو اور'' اور حنیف نے پھر تسلیمات عرض کرتے ہی چھکا مار کر کہا ''دل بڑھاتے ہیں آپ حضرات۔ ایک صاف سا کٹ عرض کیا ہے''۔ اب جو کٹ مارتا ہے تو ایک بزرگ تماشائیوں میں سے نکل کر آئے کہ ''صاحبزادے خدا عمر میں برکت دے، ہم کہنہ مشقوں کے کان کاٹتے ہو'' اور ان کے داد دینے پر تمام تماشائیوں نے داد کے شور سے زمین آسمان ایک کر دیے۔ اس لیے کہ یہ داد سند تھی اور داد دینے والے کرکٹ کے مستند اساتذہ میں سے تھے۔ حنیف کا یہ حال کہ بیٹ رکھ کر کبھی ہاتھ جوڑتے ہیں اور کبھی سلام کرتے ہیں اور باقی تمام کھلاڑی اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر حقہ پینے میں مصروف ہیں اور خاصدانوں کی طرف متوجہ ہیں۔''

امتیاز احمد کی شعر گوئی کو دنیائے کرکٹ کے انقلاب سے تعبیر کرتے ہوئے شوکت تھانوی کا استدلال ہے کہ ''اگر ایک تھانیدار شعر کہہ سکتا ہے، ایک پہلوان اکھاڑے کے علاوہ مشاعرے میں بھی جا سکتا ہے، ایک ریلوے گارڈ بجا سکتا ہے اور شعر بھی سنا سکتا ہے، ایک حکیم نسخہ بھی لکھ سکتا ہے اور غزل بھی تو امتیاز احمد بھی یقیناً کرکٹ بھی سیٹی کھیل سکتے ہیں اور شعر بھی کہہ سکتے ہیں۔''

ہم شوکت تھانوی کی تائید کیے بغیر اس لیے نہیں رہ سکتے کہ ہم نے ڈاکٹر یاور عباس اور ڈاکٹر پریم لعل شفا کو نسخے بھی لکھتے دیکھا ہے اور شعر تحریر کرتے ہوئے بھی۔ کون نہیں جانتا کہ امام بخش ناسخ نامی گرامی پہلوان بھی تھے اور بلند پایہ شاعر بھی۔ اور صاحب سیف و قلم امیر خسرو کا لوہا تو سبھی مانتے ہیں۔ سو امتیاز احمد نے جہاں ایک جانب بڑے بڑے طرم خان قسم کے گیند بازوں کو چوکے اور چھکے مارے ہیں تو دوسری جانب شاعری کے میدان میں بھی اپنی خداداد صلاحیت کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ ایک جانب کرکٹ کا میدان ہے تو دوسری جانب پاک فضائیہ کے حوالے سے بلند پرواز اور سونے پہ سہاگہ تخیل کی پرواز۔

امتیاز احمد کا مجموعہ کلام ''میرے شعر'' نظموں کے علاوہ غزل اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ابراہیم جلیس کا مختصر سا مقدمہ بھی ہے جس کو بقول شوکت تھانوی ''مقدمہ نہیں صرف وکالت نامہ کہنا چاہیے'' اس مجموعے کی پہلی نظم سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

ہم نشیں مجھ پر گزرتا ہے اک ایسا وقت بھی!\
زندگی کے سارے ہنگاموں سے تھک جاتا ہوں میں\
تنگ تر ماحول کے حلقے سے گھبراتا ہوں میں

اور انجام کار

چند لمحے پر سکوں لہروں میں بہہ لیتا ہوں میں
ہاں اسی عالم میں کھو کر شعر کہہ لیتا ہوں میں

امتیاز کی نظم ''اندیشہ'' بھی بے حد خوبصورت اور داد طلب ہے۔ کہتے ہیں:

تیرے خاموش لبوں پر یہ تکلم نمود
تیری چپ چاپ نگاہوں میں یہ الفت کا پیام
یہ تو سچ ہے کہ یہ آغاز حسیں ہے لیکن
کون جانے کہ اس آغاز کا کیا ہو انجام

ان کی ایک اور خوبصورت نظم ''چہرے'' کے دو بند ملاحظہ ہوں:

میری نظروں میں مری یاد کی محرابوں میں
کتنے خاکے ہیں کہ اس وقت بھی منڈلاتے ہیں
جن کے دم سے ہے عبارت مری دنیائے خیال
ایک اک کر کے وہ سب نقش ابھر آتے ہیں

شوکت تھانوی کے الفاظ میں ''اس مجموعے سے چند یہ نمونے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ امتیاز کی شاعری کے یا تو قائل ہو جائیے ورنہ حضرت جگر مراد آبادی سے، مولانا عبدالمجید سالک سے احمد ندیم قاسمی سے، عابد علی عابد، احسان دانش سے اور آپ کو اختیار ہے جس شاعر سے آپ کا جی چاہے کرکٹ کھلوا کر ہم کو دکھا دیجیے، یہ لوگ اناڑی نہ ثابت ہوئے تو ہمارا ذمہ۔ کم سے کم امتیاز اناڑی تو نہیں معلوم ہوتا!''

موسیقار باکمال بلند اِقبال

موسیقار بلند اقبال کے انتقال کی المناک خبر سے ذہن کو بڑا زوردار جھٹکا لگا اور دماغ تھوڑی دیر کے لیے سُن ہو کر رہ گیا۔ ابھی چند ماہ قبل ہی ریڈیو پاکستان کے کراچی اسٹیشن پر اُن سے جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو وہ نہایت ہشاش بشاش اور بالکل صحت مند نظر آرہے تھے اور کہیں سے بھی 83 برس کے سن رسیدہ نظر نہیں آرہے تھے۔ اس ملاقات میں ریڈیو پاکستان سے متعلق بہت سے دلچسپ باتیں ہوئیں اور بہت سی یادیں بھی تازہ ہوئیں، اس وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہم سے اچانک اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے اور لیاقت آباد کے اسی قبرستان میں ابدی نیند سو جائیں گے جہاں ریڈیو پاکستان کے ایک اور بڑے عہدیدار اور منفرد لب و لہجے کے شاعر عزیز حامد مدنی مدفون ہیں۔

ریڈیو پاکستان وطن عزیز کا وہ نامور ادارہ ہے جس نے بڑی بڑی قد آور شخصیات پیدا کی ہیں اور بڑے بڑے فنکاروں کو متعارف کرایا اور پروان چڑھایا ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا جب اس ادارے کا پورے ملک میں طوطی بولتا تھا، قیام پاکستان کے تاریخی اعلان کا سہرا بھی اسی ادارے کے سر ہے۔ مہدی حسن، فریدہ خانم، اقبال بانو، ریشماں، احمد رشدی اور پٹھانے خان جیسے نابغۂ روزگار فنکار ریڈیو پاکستان ہی کی دریافت اور پیداوار ہیں۔ موسیقار بلند اقبال کا شمار بھی ان ہی عظیم فنکاروں میں ہوتا ہے، وہ مشہور سارنگی نواز استاد بندو خان کے چھوٹے صاحبزادے اور امراؤ بندو خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ دونوں بھائی موسیقی کی دنیا کے آفتاب و ماہتاب تھے جنہوں نے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ پاکستان کا نام دنیائے موسیقی میں روشن کیا۔ ان کے گھرانے کے بارے میں بلا تکلف و تردد بڑی آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ ہمارے عزیز دوست امیر احمد خان (مرحوم) کا تعلق بھی دلی کے اسی نامور گھرانے سے تھا کیونکہ وہ استاد بندو خان کے داماد اور امراؤ بندو خان اور بلند اقبال کے بھانجے تھے۔

موسیقی بلند اقبال کو اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی جو سارنگی کے مانے ہوئے استاد تھے، یہ ایک فطری امر تھا کیونکہ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا والی کہاوت اپنے اندر معنی کا ایک سمندر رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی استاد امراؤ خان سے بھی کسب فیض حاصل کیا جس نے ان کے فن کو چار چاند لگادیے، اتفاق سے ان دونوں بھائیوں سے ہمارے ذاتی مراسم تھے اور امراؤ خان نے تو ہمارے بسنت کے گیتوں کے لیے استاد چاند امروہوی کے اشتراک سے بڑی خوبصورت دھنیں بھی تیار کی تھیں۔ استاد چاند امروہی کا ذکر آگیا تو ایک تیر سا قلب میں پیوست ہو گیا۔

بلند اقبال سراپا اسم باسمی تھے۔ انتہائی شریف النفس، مرنجاں مرنج اور بے حد بامروت اور وضع دار، عاجزی و انکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ان سے ملنے والے کو اس بات کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنے عظیم فنکار کے روبرو ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے فنکار اپنی شہرت کو ہضم نہیں کرپاتے اور وہ مغرور اور گھمنڈی ہوجاتے ہیں۔ مگر بلند اقبال کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا، وہ وہی پھل دار درخت کے سمان تھے جو پھل لگنے کے ساتھ ساتھ جھکتا چلا جاتا ہے۔ عام زندگی میں ایسے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں، عجز و انکساری کی سی خوبی گلوکار محمد رفیع مرحوم میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی، تبھی تو رب العالمین نے انھیں بے مثل عالمگیر شہرت و عظمت سے نوازا تھا۔

طبلہ، سارنگی ستار، شہنائی اور بانسری برصغیر کی کلاسیکی موسیقی کی روح اور آبرو ہیں۔ ان تمام سازوں میں وہ جادو بھرا ہوا ہے جو سننے والے کو مسحور و مبہوت کر دیتا ہے جس کی جیتی جاگتی مثال ہم نے پنڈت روی شنکر اور استاد رئیس خان صاحب کی صورت میں دیکھی ہیں۔ بالکل اسی طرح سارنگی نواز میں استاد بندو خان اور ان کے قابل فخر صاحبزادگان امراؤ بندو خان اور بلند اقبال نے اپنے کمال فن کا لوہا منوایا ہے۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سارنگی آج کے دور میں دم توڑتی ہوئی نظر آرہی ہے کیونکہ مغربی موسیقی کے شور میں اس کی سریلی آواز گم ہوتی جارہی ہے۔ اس صورتحال پر ہمیں محمد رفیع کے گائے ہوئے ایک فلمی گانے کے بول یاد آرہے ہیں

ٹین کنستر پیٹ پیٹ کر گلا پھاڑ مر جاتا ہے

یار مرے مت بر امان یہ گانا ہے نہ بجانا ہے

آج سے بیس پچیس برس پہلے ہم نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ موسیقی پر اتنا برا وقت بھی آئے جب اچھل کود کر گانے والے بے سرے لوگ گلوکار کہلائیں گے اور سریلے گائیک رفتہ رفتہ گمنامی کے ساگر میں ڈوبتے چلے جائیں گے۔ بعض اصحاب موسیقی تو ان حالات سے اتنے دل برداشتہ ہو گئے کہ انھوں نے گوشۂ گمنامی میں جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی، بر قول میر

میر صاحب زمانہ نازک ہے

دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

برساتی مینڈکوں کی ٹراہٹ میں بھلا سریلے گلوکاروں کی آوازیں کیسے سنائی دے سکتی ہیں۔ ایسے نامساعد حالات میں سچے فنکار اگر موسیقی سے غائب نہ ہوں گے تو پھر اور کیا کریں گے ؟ ذرا دیکھیے تو سہی کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش والا ہر فنکار اپنی میوزک البم لے کر مارکیٹ میں آ رہا ہے اور اپنے کھوٹے سکوں کو کھرا ظاہر کر کے چلا رہا ہے۔ میدان سیاست کی طرح موسیقی کے میدان میں بھی آج ہر طرف بونوں اور اتائیوں کا راج ہے جن میں سے کوئی کرتے فروخت کر رہا ہے تو کوئی لان بیچ رہا ہے۔ ان حالات میں بلند اقبال اگر رخت سفر باندھ کر سفر آخرت پر روانہ نہ ہوتے تو بھلا کیا کرتے۔

استاد بلند اقبال کا شمار بر صغیر کے بہترین سارنگی نوازوں میں ہوتا ہے، انھیں اپنے فن پر غیر معمولی عبور حاصل تھا جس کا مظاہرہ انھوں نے ریڈیو پاکستان کے ساتھ اپنی طویل وابستگی کے دوران بے شمار مرتبہ کیا۔ ان کی رحلت کے ساتھ سارنگی خاموش اور ساکت ہو کر رہ گئی ہے۔ ریڈیو پاکستان کے علاوہ فلم کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ لعل محمد اقبال کی جوڑی سے بھلا کون واقف نہیں ہے، اس جوڑی نے پاکستان کی فلم انڈسٹری کو بے شمار لازوال دھنیں عطا کی ہیں جن کی آواز کی گونج ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی۔ 1960 اور 1970 کی دہائیوں کو بھلا کون فراموش کر سکتا ہے جس کے دوران دھماکہ، بارہ بجے، جاگ اٹھا انسان، میرے لعل، دوسری ماں اور نصیب اپنا اپنا جیسی شاہکار فلموں کو موسیقی کی اس جگل جوڑی نے اپنی سدا بہار دھنوں سے سنوارا اور سجایا۔ پاکستانی موسیقاروں کی یہ جوڑی ایسی تھی کہ جس کا موازنہ با آسانی بھارت میں شنکر جے کشن اور لکشمی کانت پیارے لعل جیسی جوڑیوں سے کیا جا سکتا ہے۔

ایک بہترین کمپوزر کے علاوہ بلند اقبال موسیقی کے بہترین استاد تھے۔ موسیقی کی تعلیم دینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں کیونکہ یہ کام بڑا دقت طلب ہوتا ہے یہ کوئی شربت نہیں ہے کہ جسے گھول کر پلا دیا جائے۔ چنانچہ بلند اقبال اپنے شاگردوں کے انتخاب میں بھی بڑے سخت گیر اور محتاط تھے۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے پڑھے لکھے لوگ شامل ہیں جو اپنے استاد کو عمر بھر یاد کرتے رہیں گے۔ ایسے ہی شاگردوں کو موسیقی کی تعلیم و تربیت دینا بلند اقبال کا مشغلہ بھی تھا اور ذریعہ معاش بھی کیونکہ مہنگائی کے اس ہوش رُبا دور میں صرف ریڈیو پاکستان کی پنشن پر گزر اوقات ممکن نہ تھی۔ بلند اقبال کے انتقال سے موسیقی کی دنیا اُداس اور ویران ہو گئی ہے۔

آہ! قمر بھائی

مدت سے انتظار تھا کہ قمر بھائی کراچی آئیں گے اور ایک نیا سفر نامہ ہمراہ لائیں گے۔ مگر اس مرتبہ کچھ اور ہی ہوا۔ انھوں نے اچانک رخت سفر باندھا اور چپکے سے سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ سچ مچ یہ دنیا ایک سرائے خانہ ہے اور بالآخر ہم سب کو ایک نہ ایک دن اپنی آخری منزل کی جانب روانہ ہونا ہے۔

پل دو پل کا ساتھ ہمارا، پل دو پل کی یاری
آج رکے تو کل کرنی ہے چلنے کی تیاری

قمر علی عباسی صاحب کے سانحہ ارتحال کی اندوہناک خبر سن کر تھوڑی دیر کے لیے ذہن پر بلیک آؤٹ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ لگتا تھا کہ ذہن ماؤف ہوگیا۔ پھر جب اظہار تعزیت کیلئے امریکا فون کیا تو ان کے فرزند ارجمند وجاہت عباسی سے بات ہوئی۔ اس وقت عباسی صاحب کے جسد خاکی کو سپرد خاک کرنے کے لیے قبرستان لے جایا جارہا تھا۔

اس وقت بھی عباسی بھائی کے بارے میں اپنے احساسات و تاثرات کو رقم کرتے وقت قلب و خرمن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہے جسے الفاظ کی شکل دینے میں بڑی دقت پیش آرہی ہے۔ ریڈیو پاکستان کے پیارے پیارے ساتھی ایک ایک کر کے بچھڑتے جارہے ہیں، جن میں دو قمر بھائی شدت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک بھائی قمر جمیل جنہیں رخصت ہوئے ایک زمانہ ہوا اور دوسرے قمر علی عباسی جنہیں ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے ہیں۔ میرے یہ دونوں ہی بھائی اسم با مسمّٰی تھے یعنی چاند کی طرح سے پیارے اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے بھی روشن روشن اور مہ تاباں کی طرح ضو فشاں۔

قمر علی عباسی کا داغ مفارقت ابھی بہت تازہ ہے۔ شاید یہ زخم کبھی مندمل نہ ہو پائے۔ سالہا سال پر محیط یہ تعلق خاطر محض کل کی سی بات ہے۔ ہم دونوں ریڈیو پاکستان میں آگے پیچھے آئے تھے۔ بس فرق صرف اتنا سا تھا کہ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز لسنرز ریسرچ کے شعبے سے کیا تھا اور ہم نے شعبہ بیرونی نشریات سے۔ جی ہاں وہی شعبہ جہاں ان کی اہلیہ محترمہ نیلوفر عباسی صاحبہ بھی پروگرام کیا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ نیلوفر علیم کے نام سے مشہور تھیں اور قمر بھائی کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد نیلوفر عباسی کہلائیں۔

قمر بھائی کے بارے میں جو کچھ کہا جائے اور جتنا لکھا جائے وہ کم ہی ہوگا۔ بس یہی کہنے پر اکتفا کرنا ہوگا کہ ”خدا بخشے کہ کیا کیا خوبیاں تھیں مرنے والے میں“۔ سچ پوچھئے تو ایسے لوگ لافانی کہلائے جانے کے حقدار ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے ذہنوں اور دلوں میں ہی نہیں بلکہ ادب و نشریات کی تاریخ میں بھی تا بہ ابد زندہ و تابندہ رہیں گے۔ قمر بھائی نے امروہہ، ضلع مراد آباد، یوپی کے ایک ممتاز خاندان میں جنم لیا۔ جی ہاں! وہی مردم خیز امروہہ جس کی مٹی سے رئیس امروہوی، جون ایلیا اور کمال امروہوی جیسے باکمال لوگ پیدا ہوئے اور پوری دنیا میں اپنا نام روشن کیا۔ ہماری طرح قمر بھائی کے منہ میں بھی پیدائش کے وقت کوئی چمچہ نہیں تھا۔ چنانچہ انھیں بھی ہماری طرح علامہ اقبال کی اس ہدایت پر عمل کرنا پڑا کہ:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

اس اعتبار سے انھیں بھی زندگی میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ وہ تادم آخر انتہائی پامردی کے ساتھ موج حوادث سے ہنستے کھیلتے رہے۔ قمر بھائی یاروں کے یار تھے اور ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا جن میں خواص و عوام دونوں قسم کے لوگ شامل تھے۔ ہمارا اور ان کا ساتھ بہت پرانا اور قلبی تھا جس میں شائستہ بے تکلفی کا عنصر نمایاں تھا۔ سب سے بڑی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تعلق خالصتاً اخلاص کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور ہمیشہ اسی طرح برقرار بھی رہا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس پر کبھی کوئی آنچ آئی ہو یا کبھی کسی بھی قسم کی کوئی رنجش یا بد گمانی پیدا ہوئی ہو۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا اور احترام کرنا اس باہمی رشتے کی اساس تھا۔ قمر بھائی بڑے زندہ دل اور باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ وہ مزاجاً ایک مجلسی انسان تھے، روتوں کو ہنسانے والے اور اپنے برجستہ فقروں سے اہل محفل کو لوٹ پوٹ کر دینے والے۔ ان کے جملوں میں تلوار کی سی کاٹ ہوا کرتی تھی جو ان کی بذلہ سنجی کی نمایاں خوبی تھی۔ جدت طرازی ان کے خمیر میں شامل تھی جس کا عکس ان کے پروگراموں اور ان کی تحریروں میں بالکل واضح طور پر نظر آتا ہے۔ تقریر اور تحریر پر انھیں یکساں ملکہ حاصل تھا اور ان کی تحریریں بھی بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ بچوں سے انھیں مخصوص لگاؤ تھا اور شاید بچوں کے ادب سے ہی انھوں نے لکھنے لکھانے کا آغاز بھی کیا تھا۔ ''بہادر علی'' سے انھیں بڑی زبردست شہرت حاصل ہوئی جسے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے کراچی اسٹیشن کا ڈائریکٹر بننے کے بعد انھوں نے کئی نشریاتی تجربے بھی کیے، جن میں ''صاحب بی بی'' نامی پروگرام نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی جس میں نامور شخصیات کیساتھ بے تکلف ملاقات کرائی جاتی تھی اور میاں بیوی دونوں ہی شامل ہوتے تھے۔

قلم اور ریڈیو پاکستان کے حوالے سے ہمارے اور قمر بھائی کے درمیان ایک اور قدر بھی مشترک ہے کہ پے در پے تبادلوں کی صورت میں ہم دونوں نے دربدر کی خاک بھی بہت چھانی۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور اس کے باہر ملک اور بیرونی ملک دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے بہت سے پیارے پیارے اور نہایت بے لوث دوست بھی نہ صرف ہمارے درمیان ایک قدر مشترک ہیں بلکہ ایک مشترکہ سرمایہ بھی ہیں۔